"تدوینِ اُصولِ فقہ"

مُرتبہ

قاضی محمد عبد الرحمٰن ایم۔اے عثمانی

اُستاذ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

کتابیات (مآخذ)

اس مقالہ کی تیاری میں حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:۔

١۔ القرآن العظیم
٢۔ بخاری و مسلم
٣۔ فتح الباری للحافظ ابن حجر العسقلانی
٤۔ الانصاف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
٥۔ ازالۃ الخفا ایضاً
٦۔ تاریخ بغداد للخطیب
٧۔ مقدمہ ابن خلدون
٨۔ وفیات الاعیان للقاضی ابن خلکان
٩۔ التاریخ الکامل لابن اثیر
١٠۔ تاریخ التشریع الاسلامی للخضری
١١۔ فتح القدیر لابن الہمام
١٢۔ بدایۃ المجتہد للعلامہ ابن رشد المالکی
١٣۔ فواتح الرحموت للعلامۃ بحر العلوم
١٤۔ مسلم الثبوت للعلامۃ البہاری
١٥۔ الرسالۃ للامام الشافعی ۔
١٦۔ احکام الاحکام للعلامۃ الآمدی
١٧۔ القواصم والعواصم لابی بکر بن العربی
١٨۔ تاسیس النظر للدبوسی (مطبوعہ قاسمی دیوبند)
١٩۔ لسان المیزان لابن حجر العسقلانی دائرۃ المعارف
٢٠۔ اصول قانون سرجان سامنڈ مترجمہ سر رضا علی
٢١۔ اعلام الموقعین للحافظ ابن قیم
٢٢۔ نیل الفرقدین للعلامۃ انور شاہ الکشمیری
٢٣۔ خزائن الاسرار للعلامۃ انور شاہ الکشمیری
٢٤۔ المستصفی للغزالی
٢٥۔ الجواہر المضیئۃ لعبد القادر المصری
٢٦۔ الفوائد البہیۃ فی طبقات الحنفیہ مولانا عبد الحی فرنگی محلی
٢٧۔ توالی التاسیس للحافظ ابن حجر العسقلانی
٢٨۔ حسن المساعی فی سیرۃ الاوزاعی للامیر شکیب ارسلان
٢٩۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبی
٣٠۔ مناقب الامام الاعظم لملا علی قاری
٣١۔ کتاب الانساب للسمعانی
٣٢۔ روضۃ الصفا (تاریخ فارسی)
٣٣۔ شرح احیاء العلوم للعلامہ مرتضی الزبیدی البلگرامی
٣٤۔ کشف الظنون حاجی خلیفہ
٣٥۔ مفتاح السعادۃ طاش کبری زادہ

عرضِ اوّلین

ازمرتب عفی عنہٗ

یہ میرا ایک امتحانی مقالہ ہے، طالب علمانہ کوشش ہے، نقائص کا رہ جانا لازمی ہے اسی کے ساتھ میں اس کا بھی اعتراف تشکریہ کے ساتھ کرنا ضروری قرار دیتا ہوں، کہ اگر حضرت الاستاذ مولانا سید مناظر احسن گیلانی (صدر شعبۂ دینیات) شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ کی نگرانی کی سعادت مجھے اس مقالہ کی تیاری میں حاصل نہ ہوتی تو جو کچھ بھی ہوگیا ہی شائد نہ ہوسکتا تھا کہ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر کسی زبان حتیٰ کہ عربی میں بھی مستقلاً کسی نے قلم نہیں اُٹھایا تھا حضرت الاستاذ ہی نے مقالہ کا خاکہ تیار کیا۔ آپ ہی نے مصادر و مآخذ کی نشاندہی کی ہیں نے ان ہی کے طریقۂ فکر کی جو اسلامی علوم میں وہ رکھتے ہیں، اس مقالہ میں پیروی کی ہی خصوصیت کے ساتھ فقہ اسلامی میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا جو مقام ہے یہ براہ راست آپ کے خیالات سے ماخوذ ہیں جن کی تفصیل "تدوین اصول فقہ" نامی کتاب میں آپ نے کی ہے، غالباً یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس کی طرف شائد ہی کسی کی توجہ ہوئی ہو، ناظرین سے ایک ضروری بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ اصول فقہ کے بانی اول چونکہ امام شافعی ہیں اس لیے ابتدا میں یہ بتانے کے لیے کہ حضرت امام کے دل میں اس فن کی تدوین کا خیال کیوں پیدا ہوا۔ شروع میں مجھے ذرا طوالت سے کام لینا پڑا ہے ممکن ہے کہ ابتداءً اصول فقہ سے اس تمہیدی بیان کا تعلق معلوم نہ ہو، لیکن آخر میں آپ خود اندازہ کرلیں گے کہ اس تمہید کے بغیر یہ بات پورے طور سے ذہن نشین نہیں ہوسکتی تھی۔

خاکسار

عبدالرحمٰن ایم۔اے عثمانی

استاذ کلیہ جامعہ عثمانیہ

(حیدرآباد دکن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

بنی نوع انسانی کا وہ تاریخی انقلاب جس کا نام "اسلامی انقلاب[1]" ہے اگرچہ سارے جہان کا یہ ایک ایسا عمومی انقلاب تھا جس کے دور رس آثار و نتائج سے نہ مشرق بچ سکا ہے اور نہ مغرب، لیکن ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے ایمانی عہد و پیمان کے انقلاب کے اس آسمانی پیغام کو قبول کیا تھا اور "فآمنا" کے اعتراف اذعانی کا اعلان جن لوگوں نے ایمان کے منادی[2] صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا ان کا حال تو بقول حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ یہ ہو گیا تھا اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا تھا کہ

گویا الیوم از شکم ما در بظہور آمدہ اند چہ علوم رسمیہ و تجربیہ کہ پیش از بعثت سید الرسل علیہ السلام معلوم ایں شان بود ہمہ در سطوتِ فیوض نازلہ از جانب مدبر السماوات والارض جلت قدرتہ متلاشی گشتہ و در ہر باب غیر از حکمِ مخبر صادق وظیفہ ایں شان نہ بود" (ازالۃ الخفاء ج۲ ص۱۲)

گویا اسلام سے پہلے کا ان کا ہر شنیدہ ناشنیدہ اور ہر دیدہ نادیدہ بن گیا۔ اب وہی سنتے تھے جو ان کو پیغمبر کی جانب سے سنایا جاتا تھا اور وہی دیکھتے تھے جو پیغمبر کی طرف سے ان کو دکھایا جاتا تھا۔

کہ یہی قرآن کا نہ صرف ان سے بلکہ خود ان کے پیغمبر سے بھی مطالبہ تھا مختلف الفاظ میں قرآن

---

[1] اسی عالمگیر اسلامی انقلاب کے اثرات تھے جو اقطاع عالم میں مختلف مذہبی تحریکیں مختلف ناموں سے نمایاں ہوئیں ہندوستان میں گرونانک صاحب جیسا کہ سب جانتے ہیں انھیں تعلیمات سے متاثر ہو کر ایک مذہب کی بنیاد رکھی اور پھر برہمو سماج کے بانی راجہ رائے موہن رائے اسی انقلابی تحریک کے بعض اصولوں کو لے کر اپنا سماج قایم کرتے ہیں مغربی دنیا بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکی جب قدیم عیسائی تعلیمات کی روح مردہ ہو چکی تھی اور مذہب میں نفسانی خواہشات غالب تھے اسلام کی عالمگیر انقلابی تحریک ہی کے بعد مارٹن لوتھر نے عیسائی دنیا میں ایک انقلاب انگیز قدم اٹھایا جو پروٹسٹنٹ نظام کے نام سے موسوم ہے یہ بھی یقیناً اسی اسلامی انقلاب سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ خود کیتھولک پادریوں نے لوتھر پر مسلمان ہو جانے کا الزام لگایا تھا ۱۲

[2] رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ (آل عمران ع۲۰) ترجمہ: اے پروردگار ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا کہ وہ ایمان لانے کے لیے پکار رہا ہے تو ہم نے اس کی بات مان لی ۱۲

دُہرا دُہرا کر اصرار کر رہا تھا کہ

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (مائدہ ع)

بے شک ہم نے یہ کتاب آپکے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق کے ساتھ موصوف ہے اور اس سے پہلے جو کتابیں ہیں ان کی بھی تصدیق کرتی ہے اور ان کتابوں کی محافظ ہے (اس لیے) آپ انکے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجیے اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر انکی خواہشوں کے موافق عمل نہ کیجیے۔"

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ (مائدہ ع)

اور ہم حکم دیتے ہیں کہ آپ انکے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجیے اور انکی خواہشوں پر عملدرآمد نہ کیجیے یعنی اس بات سے احتیاط رکھیے کہ وہ آپکو خدا کے بھیجے ہوئے حکم سے بچلا دیں (فتنہ یا آزمائش میں ڈالدیں)

دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ

آپکے پاس علم (قرآن) آنے کے بعد اگر آپنے انکی خواہشوں کی پیروی کی تو آپکے لیے اللہ کی طرف سے کوئی مددگار و دوست نہیں۔

چونکایا جا رہا تھا۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ۔

اگر آپ علم آنے کے بعد بھی اُن کافروں کی خواہشوں کی اتباع کرینگے تو اس صورت میں یقیناً آپ حد سے تجاوز کرنے والے ہونگے

اسرائیلی شریعت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ

لَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ۔

ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکم اور نبوت دی تھی اور پاک چیزیں کھانے کو دی تھیں۔ اور ہم نے دنیا جہان والوں پر ان کو فوقیت دی تھی۔

پیغمبر کو خطاب کیا گیا۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّهُمْ

پھر ہم نے آپکو دین کے ایک خاص طریقے پر کر دیا اس لیے آپ اسی طریقے پر چلیے اور ان جہلا کی خواہشوں پر نہ چلیے

لَنْ یُّغْنُوْا عَنْکَ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ھٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (الجاثیہ ع ۲)

یہ لوگ خدا کے مقابلہ میں تیرے ذرا بھی کام نہیں آ سکتے اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ متقیوں کا دوست ہے یہ قرآن، عام لوگوں کے لیے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کیلیے بڑی رحمت

اور یہی شریعت ہے جس کا نام "الاسلام" رکھا گیا اور اعلان کر دیا گیا

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔

اور جو شخص "الاسلام" کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔

مسلمانوں کو کہہ دیا گیا کہ:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ۔

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

صاف صاف کھلے کھلے الفاظ میں مسلمانوں کو سنا دیا گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا۔

جو لوگ اللہ و رسول کے ساتھ کفر کرتے ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ و رسول کے درمیان تفرقہ ڈلوائیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم (قرآن کے) بعض حصوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ لوگ اس کے (کفر و اسلام کے) درمیان ایک راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں یہی لوگ پکے کافر ہیں۔

وہی "شریعت" جس کی پوری پوری پابندی اور اتباع پر قرآن مُصر تھا اس سے ہٹ کر فیصلہ چاہنے والوں کے متعلق فرمایا گیا۔

اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (مائدہ ع ۷)

یہ لوگ پھر کیا زمانہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، اور فیصلہ کرنے میں یقین کرنے والوں کے نزدیک اللہ سے بہتر کون ہے؟

انسانی زندگی کے وہ تمام شعبے جن کے متعلق "شریعت" احکام نافذ کر چکی تھی بجائے شریعت کے "حکم الجاہلیت" جو دراصل غیر شرعی یا غیر اسلامی نظام حیات کی دوسری تعبیر ہے اس کی طرف رجوع کرنے

والوں کے متعلق قرآن ہی میں ارشاد فرمایا گیا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا
بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا
بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا
(النساء ع)

کیا آپ ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ جو چیز آپ پر نازل ہوئی ہے اس پر ایمان لاچکے ہیں اور نیز جو آپ سے پہلے نازل ہوئی ہے اس پر (قرآن اور دوسری کتب) بھی ایمان لاچکے ہیں وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ باہمی معاملات میں فیصلہ کیلئے "الطاغوت" کو حکم بنائیں حالانکہ ان کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں اور "الشیطان" یہی چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو دور کی گمراہی میں ڈالدے۔

ظاہر ہے کہ جو قرآن ان مطالبوں سے معمور تھا اس پر ایمان لانے والوں اور اس کو خدا کا مطالبہ یقین کرنے والوں پر گویا "یوم از شکم مادر بظہور آمدہ اند" کی حالت طاری ہوجائے تو اس کے سوا کوئی دوسرا اثر ان مطالبوں کا اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟ اسی کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ اپنی شخصی زندگی ہو یا خاندانی و قومی ہو یا عام انسانی تعلقات، نیز خالق و مخلوق میں جو تعلق قرآن نے قایم کیا تھا الغرض زندگی کے ان تمام شعبوں میں جنھیں شریعت نے اپنے دائرہ بحث میں لیا تھا مسلمان مجبور تھے کہ اسے سمجھیں بوجھیں اور اسی پر اپنی عملی زندگی کو گردش دیں۔

پھر خود قرآن میں بھی حکم دیا گیا تھا:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ
لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ (توبہ ع ۱۶)

ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ (علم) حاصل کریں (جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے ہر گروہ میں کچھ لوگوں کو چاہیے کہ دین میں تفقہ حاصل کریں) دراصل یہی آیت "بعد کو اس عظیم اسلامی علم کی بنیاد بن گئی" جو "علم الفقہ" کے نام سے موسوم ہے۔

دین میں تفقہ کا مطلب

تفقہ فی الدین کیا چیز ہے مشہور حدیث

نَضَّرَ اللّٰہُ امرأً سمع منا حدیثًا فاداہ
کما سمعہ فرب حامل فقہٍ غیر فقیہ ورب حامل
فقہ الی من ھو افقہ منہ۔

اللہ تعالیٰ اس شخص کا چہرہ تروتازہ رکھے جو کوئی ہم سے کوئی حدیث سنے اور اس کو پوری طرح ادا کردے، بسا اوقات ایک غیر فقیہ کسی فقیہ تک بات پہونچا دیتا ہے اور بہت سے فقیہ اپنے سے فقیہ تر اصحاب تک پہونچا دیتے ہیں۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ جن الفاظ میں شریعت کی تعبیر کی گئی ہو اس کے منشا کو پانا اور جو صحیح غرض اس کلام کی ہو اس تک پہنچنا، یہی تفقہ کا مطلب ہے۔ ورنہ جو صرف قانون کا حافظ ہے وہ "حامل قانون" ہے نہ کہ اس کا فقیہ۔ بہرحال اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقہ کہیے یا تفقہ اس کا تعلق اس کلام سے ہے جس میں شارع نے اپنے مقصد کو ظاہر کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کسی "دستور العمل یا قانون" کو مان لینے کے بعد یا یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ تفقہ کا یہ فریضہ قدرتی طور پر خود بخود عائد ہو جاتا ہے۔ سر جان سالمنڈ (Sir John Salmond) نے اپنی مشہور کتاب "اصول قانون" میں قانون کے متعلق تفقہ کے اس قدرتی فریضہ کی یہ تعبیر بالکل صحیح کی ہے کہ

"الفاظ کی پابندی کرنی اور واضع قانون کے منشاء کو دریافت کرنا عدالتوں کا مخصوص فرض ہے"۔

(ص ۲۲۵۔ اصول قانون سر جان سالمنڈ)

سچ پوچھیے تو بجائے قانون کے یہی مخصوص فرض جب شریعت کے ماننے والوں پر عائد ہوتا ہے تو اسکا اصطلاحی نام فقہ یا تفقہ ہے لیکن کیا تفقہ صرف شریعت کے الفاظ ہی تک محدود ہے؟ اس میں شک نہیں جیسا کہ اس نیوزی لینڈ کے (of Newzealad) مقنن نے لکھا ہے کہ

"الفاظ کی پابندی" اور ان ہی پابندیوں کے ساتھ واضع قانون کے منشاء کا دریافت کرنا "فقیہ" کا سب بڑا فرض ہے" لیکن بخاری کی دوسری مشہور حدیث جو ابن عباس سے مروی ہے۔

انّ النبی صلعم دخل الخلاء فوضعت له وضوءً قال من وضع هذا فاخبر فقال اللهم فقهه فی الدین۔

نبی کریم صلعم بیت الخلا تشریف لے گئے میں نے آپکے لیے پانی (لوٹے میں) رکھ دیا (دروازہ کے قریب) آپنے فرمایا کس نے رکھا آپکو اسکی خبر دی گئی تو آپ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ انکو دین میں سمجھ بوجھ عطا کر

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں اسکندریہ کے علامہ جلیل ابن المنیر کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے کہ:۔

مناسبة الدعا لابن عباس بالتفقه علی وضعه الماء من جهة انه تردد بین ثلاثة امور اما ان یدخل الیه بالماء الی الخلاء او یضعه علی الباب لیتناوله من قریب او لا یفعل شیئا، فرأی الثانی اوفق لان فی الاول تعرض للاطلاع والثالث

ابن عباس کیلیے دین کے سمجھ بوجھ کی دعا کی مناسبت یہ ہے کہ انہوں نے پانی دروازے کے قریب رکھنے میں چند چیزوں میں سے ایک چیز کو انتخاب کیا کیونکہ وہ پہلے متردد ہوئے کہ تین چیزوں میں سے کونسی چیز اختیار کریں یا تو وہ بیت الخلا میں داخل ہو جائیں (جس سے کشف ستر ہوتا جو ظاہر ہے کہ منشاء نبوت کے مغائر تھا) یا اسکو دروازہ کے قریب رکھیں تاکہ

2547

يستدعي مشقة في طلب الماء والثاني اسهلها
(فتح الباری ج ۱ ص ۲۱۵)

آپ اسکو لے لیں یا کچھ نہ کریں ان امور میں آپنے دوسری صورت کو اپنی طبیعت کیلئے زیادہ موافق سمجھا کیونکہ پہلی صورت میں بے پردہ دیکھنے کا احتمال تھا اور تیسری صورت میں آنحضرت صلعم کو پانی حاصل کرنے میں مشقت لاحق ہوتی اور دوسری صورت ان سے بہت آسان تھی"

ظاہر ہے کہ ابن عباس کا یہ فعل شارع علیہ السلام کے کسی قول خاص سے ماخوذ نہ تھا لیکن انھوں نے آنحضرت کے کلی منشا اور مذاق نبوت کو پیش نظر رکھ کر ایک کام کیا اور انکا یہ کام "دین کا تفقہ" قرار پایا جس سے معلوم ہوا کہ تفقہ کی ایک صورت تو وہ ہے جو سرجان نے قانون سے متعلق بیان کی ہے لیکن دین کے تفقہ کا دائرہ اس سے زیادہ اپنے اندر وسعت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے فقہ کا ترجمہ "جاننا" یعنی "علم" کیا ہے ان سے اختلاف کرتے ہوئے علامہ آمدی نے اپنی کتاب احکام الاحکام میں فقہ کو عربی کے لفظ فہم کا مرادف قرار دے کر لکھا ہے کہ

وقیل "العلم" والاشبہ ان الفهم مغائر للعلم اذا لفهم عبارة عن جودة الذهن من جهة تهيأه لاقتناص كل مايرد عليه من المطالب ثم

بعضوں نے فقہ کا ترجمہ علم (یعنی جاننا) کیا ہے۔ لیکن اقرب الی الصواب یہ بات ہے کہ فقہ جس کا صحیح ترجمہ فہم (یعنی سمجھنا بوجھنا) ہو سکتا ہے یہ علم اور جاننے سے الگ چیز ہے۔ فہم یعنی سمجھنے کی کیفیت دراصل ذہن کی پختگی کی تعبیر ہے۔ یعنی جس کی وجہ سے وہ سب کچھ جو آدمی پر پیش ہو ان کا شکار کر سکتا ہو اور انکو اپنے قابو میں لا سکتا ہو۔

گویا یہ وہی بات ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ حامل ہونا کسی کلام کا اور بات ہے اور اس کا فقیہ ہونا دوسری چیز ہے۔ فقیہ وہی ہو سکتا ہے جو دراصل کلام کے منشار کو پانے کی کوشش کرے اور بولنے والے کا جو مطلب اور غرض ہو اس کو اپنے قابو میں لائے۔

بہرحال اسلام کے پیشتر کے تمام رسوم و رواج آئین و دستور سے مسلمانوں کا بالکلیہ تعلق توڑ کر قرآن نے جب ان کو "شریعة من الامر" کے نیچے پوری سختی کے ساتھ داخل کر دیا تو ایک فرض تو ان پر یہ عائد ہوا کہ شارع علیہ السلام کے صحیح مقصد کو پانے کی کوشش کریں۔

دوسرا فرض | لیکن اس سلسلہ میں ان کے فرائض اسی پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ایک ناگزیر قدرتی ضرورت اور بھی رہ جاتی ہے۔ علامہ ابن رشد مالکی اپنی کتاب بدایۃ المجتہد میں اس ضرورت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

ان الوقائع بين اشخاص الاناسي غير متناهية والنصوص والافعال و

مختلف افراد انسانی کے درمیان جو وقائع اور حوادث پیش آتے ہیں وہ لامحدود ہیں اور شریعت کے نصوص یا پیغمبر کے افعال یا ان کے

والافراد ات متناهية ومحال ان يقابل مالايتناهي بمايتناهي۔	افرادات دینی جو باتیں انکے سامنے ہوئیں اور ان سے روکا گیا) بہرحال محدود ہیں اور محال ہو کہ کوئی محدود امر کسی غیر محدود کا احاطہ کرے۔

مطلب یہ ہو کہ "شریعت" کی تعبیر جن الفاظ میں کی گئی ہے یہ ظاہر ہو کہ وہ محدود ہیں لیکن قیام قیامت تک دنیا کے مسلمانوں میں جو حوادث و واقعات ان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں پیش آتے ہیں گے وہ لامحدود ہیں پس یہ تو ناممکن تھا کہ شریعت اپنے محدود الفاظ میں ان غیر محدود حوادث و جزئیات کا احاطہ کرتی

اب ایک طرف تو شریعت ہی کا مطالبہ یہ ہو کہ

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الجاثیہ ع)	پھر ہم نے آپکو دین کے ایک خاص طریقے پر کر دیا اسلیے آپ اس طریقے پر چلیے اور ان جہلا کی خواہش پر نہ چلیے۔

یعنی جو شریعت سے ناواقف ہیں ان کے آراء اور مشوروں سے بچنے کا حکم ہو لیکن لامحدود حوادث و واقعات کا احاطہ شریعت کے محدود الفاظ میں ناممکن بھی ہو۔ پھر کیا کیا جائے؟——

یہ احتمال کہ شریعت ہی کو اس صورت میں اتنی وسعت کیوں نہ عطا کی گئی کہ آئندہ ہر پیش آنے والے جزئیہ کا جواب اس میں مل جاتا ایک قطعاً غیر عقلی احتمال ہو۔ اسلیے کہ جتنی بھی وسعت اختیار کی جاتی بہرحال وہ محدود ہی ہوتی اور محدود سے لامحدود کا احاطہ ناممکن ہو اور بالفرض مطلق لامحدودیت جزئیات تسلیم نہ بھی ہو پھر بھی ان کے بے پایاں وسعت کا انکار نہیں کیا جا سکتا اس لیے یہ واقعہ ہو کہ کسی قانون کی تعبیر میں لفظی فیاضیوں سے جتنا بھی زیادہ کام لیا جائے تجربہ بتا رہا ہو کہ سارے جزئیات و حوادث کے ہر پہلو کا احاطہ ناممکن ہو حافظ ابن قیم نے سچ لکھا ہو

من ا- باشرة بفتاوى الناس يعلم ان المنقول وان اتسع غاية الاتساع فانه لايفي بوقائع العالم جميعها (اعلام الموقعين ج ۲)	جو لوگ عموماً فتوی دینے کا کام کرتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ نقل شدہ علم اگرچہ نہایت وسیع ہے تاہم دنیا کے تمام واقعات اور حوادث کیلیے وہ کافی نہیں ہو سکتا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ آٹھویں صدی ہجری کے عالم ہیں جس زمانے تک فقہی جزئیات کے فتاوی کی ضخیم ضخیم کتابیں مدون ہو چکی تھیں لیکن ابن قیم انکو بھی ناکافی قرار دے رہے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہو کہ عام معمولی عدالتی قانون بن کا ظاہر ہو کہ انسانی زندگی کے چند پہلوؤں سے جو تعلق ہوتا ہو۔ وہ کسی خاص [illegible] خاص زمانے تک کیلیے نافذ کیا جاتا ہو لیکن جو لوگ قانونی تجربہ

رکھتے ہیں آج تک کو اس کا اقرار کرنا پڑا ہو یہی نیوزی لینڈ کا مقنن سرجان سالمنڈ لکھتا ہے:

"بہرحال کسی ملک کے ججوں کے اختیار تمیزی کے بغیر صرف قانون کے ذریعہ سے انفصال مقدمات کرنا ممکن نہیں" (ص ۲۲ اصول قانون)

اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس شریعت کا دائرہ مشرق و غرب، عرب و عجم کے "کافۃ للناس" کیلئے تھا اور تا قیام قیامت ابدی دستور کی شکل میں جو دین مسلمانوں کو دیا گیا تھا اس کے متعلق یہ کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ ہر ہر پیش آنے والے نئے حوادث و واقعات کا صریح جواب اس میں موجود ہو، یہی نکتہ ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

"فالوقائع المتجددة لاتوفی بها النصوص" (ص ۳۳) | کہ نت نئے پیش آنیوالے واقعات کا احاطہ نصوص نہیں کر سکتے۔

دراصل یہی وہ دوسری ضرورت تفقہ فی الدین کی ہے یعنی نصوص اور صریح تعبیروں کو پیش نظر رکھکر ان حوادث و واقعات کے متعلق شریعت کے منشار کی پابندی کرتے ہوئے احکام پیدا کرنا یہ دوسرا قدرتی فرض ہے جو امت پر عائد ہوا۔ اور تفقہ فی الدین کے اس شعبہ کا نام دراصل "قیاس" رکھا گیا ہے۔

پس حاصل یہ ہوا کہ جن تعبیروں میں شریعت مسلمانوں کو عطا ہوئی ہے پہلے خود ان میں غور و خوض کرنا اور شارع علیہ السلام کے صحیح منشار کو پانا یہ تو تفقہ فی الدین کا پہلا شعبہ ہے اور نئے پیش آنیوالے نت نئے حوادث و واقعات کے متعلق بھی شارع کے منشار کو پیش نظر رکھ کر جدید احکام پیدا کرنا یہ تفقہ فی الدین کا دوسرا شعبہ ہے" حادی قدسی کے حوالے سے فقہ کی صحیح تعریف صاحب بحر الرائق نے یہ نقل کی ہے:

اعلم ان معنی الفقہ فی اللغۃ الوقوف والاطلاع وفی الشریعۃ الوقوف الخاص وھو الوقوف علی معانی النصوص واشاراتھا ودلالاتھا ومضمراتھا ومقتضیاتھا والفقیہ اسم للواقف علیھا۔ (بحر الرائق ص ۶ ج ۱)

جاننا چاہیئے کہ لغت میں "فقہ" کے معنی "مطلع ہونا" ہے اور شریعت میں کسی خاص چیز پر مطلع ہونے کے ہیں اور وہ نصوص کے اشارات، دلائل مضمرات اور اس کے اقتضاءات پر مطلع ہونا ہے۔ اور فقیہ اس شخص کا نام ہے جو ان چیزوں سے واقف رہتا ہے۔

...ن کے طبعی اختلافات ...ر فقہی رجحانات پر

بہرحال یہ تو وہ ضرورت تھی جس نے اسلام میں فقہ کے فریضہ کا اضافہ کیا اور اسی فریضہ نے اسی علم کو پیدا کیا جس کا نام ہی بعد کو "علم الفقہ" ہو گیا۔

لیکن خدا کی یہ عجیب شان ہے کہ انسانی افراد اگرچہ ہیں تو افراد ایک ہی نوع کے اور نوعی وحدت

کے آثار و لوازم کم و بیش سارے انسانی افراد میں پائے جاتے ہیں مگر اسی کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ قدرت نے جس طرح ہر فرد انسانی کی شکل و صورت الگ الگ بنائی ہے جس سے ہم ایک کو دوسرے سے جدا کرتے ہیں بجنسہ یہی حال طبائع اور رجحانات کا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بایں ہمہ یک رنگی ہر شخص اپنے اندر ظاہری خصوصیتوں کے ساتھ کچھ باطنی خصوصیات بھی رکھتا ہے بلاشبہ یہ قدرت کی شانوں میں سے عجیب شان ہے کہ بایں ہمہ وحدت اس نے کثرت کا یہ عجیب و غریب مرقع ہمارے سامنے پیش کیا ہے تجربہ بتاتا ہے کہ بایں ہمہ اتحاد ایک انسان کے ابہام (انگشت) کا نشان دوسرے آدمی کے ابہام کے نشان سے نہیں ملتا صدق مولٰنا الکریم فِیْ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ۔

بلاشبہ ہر ہر صورت کے ساتھ ہر فرد انسانی کو مرکب کرنا اس سے مشیت الٰہی کی قاہرانہ قوتوں کا اندازہ ہوتا ہے لیکن ان ظاہری اور باطنی اختلافات کا نتیجہ یہ ہوا اور یہی ہو بھی ہو سکتا تھا کہ شریعت کی تعبیروں سے شارع کے صحیح منشا تک پہونچنے میں بھی اور شرعی تصریحات کی روشنی میں نئے حوادث و وقائع کے متعلق جدید احکام پیدا کرنے میں بھی ان لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا جنھوں نے "تفقہ فی الدین" کے کفائی فرض کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنایا۔

عہد نبوت کے بعد ان اختلافات نے جو صورت اختیار کی ہے اس کا ذکر تو آئندہ آرہا ہے۔ خود اس زمانہ میں جب مسلمانوں میں صاحب وحی اور شارع علیہ السلام موجود تھے ہم دیکھتے ہیں کہ ان اختلافی رجحانات کے اثرات پائے جاتے ہیں قرآن میں حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ کی آیت نازل ہوتی ہے بعض صحابہ بجائے رات اور صبح کی سیاہی و سفیدی کے اسکو واقعی خیط (تاگہ) کی سپیدی اور سیاہی پر محمول کرتے ہیں یا عمار بن یاسر کو غسل کی حاجت سفر میں پیش آتی ہے۔ پانی نہیں ملتا ہے۔ وضو کا قایم مقام جو تیمم تھا اس کا مسلمان کو معلوم ہے لیکن غسل میں بھی تیمم کرنا چاہیئے یا نہیں گویا ایک جدید حادثہ پیش آتا ہے جس کی شریعت میں تصریح موجود نہ تھی، وہ قیاس سے کام لیتے ہیں اور مٹی میں لوٹتے ہیں فرماتے ہیں جیسے جانور مٹی میں لوٹتا ہو اسی طرح لوٹا اور اس کو انھوں نے غسل کا قایم مقام تیمم قرار دیا۔
اس قسم کی مثالیں اور بھی عہد نبوت میں مل سکتی ہیں میں نے صرف ان دو مثالوں پر اس لیے قناعت کی کہ پہلی مثال تفقہ فی الدین کے پہلے شعبہ سے تعلق رکھتی ہے یعنی شارع کے منشاء کو شرعی الفاظ سے پانے کی کوشش میں غلطی کی مثال پہلی مثال ہے اور نئے حادثے کے متعلق شریعت کے تصریحات کو پیش نظر رکھ کر جدید حکم پیدا کرنا اور اسمیں چوک جانا اس کی مثل دوسری مثال ہے۔

مگر ظاہر ہے کہ نبوت کا عہد ایسا عہد تھا کہ خود شارع علیہ السلام مسلمانوں میں موجود تھے تفقہ کے اس شعبہ میں ہو یا اس شعبہ میں، جب کسی سے کوئی غلطی صادر ہو جاتی تھی تو بقول حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

در زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در ہمہ انواع علوم ہم بر جمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مید اشتند وہرچہ پیش می آید از مسائل جہاد و ہدنہ و عقد و جزیہ و احکام فقہیہ و علوم زہدیہ ہمہ از آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم استفسار می نمودند (ازالۃ الخفاء ص ۱۴۰ ج ۲)

جیسا کہ پہلی مثال کے راوی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہوں نے واقعی سیاہ اور سفید تاگے کا مطلب قرآنی آیت کا سمجھا تھا خود فرماتے ہیں،

لما نزلت حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود عمدت الی عقال اسود وعقال ابیض فجعلتہما تحت وسادتی وجعلت انظر من اللیل فلا یستبین لی فغدوت الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت لہ فقال ان وسادتک لعریض ان کان الخیط الابیض والخیط الاسود تحت وسادتک

(جب حتی یتبین لکم .. الخ کی آیت نازل ہوئی تو میں نے ایک سیاہ ڈوری اور ایک سفید ڈوری (اونٹ کو باندھنے کی) لی اور دونوں کو تکیہ کے نیچے رکھ دیا اور رات کے وقت ان کو دیکھنے لگا تو مجھے فرق ظاہر نہیں ہوا۔ صبح ہی میں آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کو بیان کیا آپ نے فرمایا کہ تمہارا تکیہ بہت عریض ہے کہ اس کے نیچے خیط ابیض اور خیط اسود آ گئے۔)

بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا انک لعریض القفا (تمہارا گونڈھا بہت چوڑا ہے) اور آخر میں سمجھا دیا کہ انما ذلک سواد اللیل وبیاض النہار (اس آیت میں خیط ابیض اور اسود سے رات اور دن کا اندھیرا اجالا مراد ہے)

اسی طرح دوسری مثال کے راوی حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی یہی فرماتے ہیں۔

اجنبت فلم اجد الماء فتمرغت فی الصعید کما تمرغ الدابۃ ثم اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت ذلک لہ فقال انما یکفیک ان تصنع ہکذا وضرب بیدیہ ضربۃ علی الارض فنفض یدیہ فمسح وجہہ وکفیہ۔ (صحاح ستہ)

میں جنبی ہوا اور مجھے پانی نہیں ملا تو میں مٹی میں لوٹا جیسے چوپایہ لوٹتا ہے اس کے بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس کا ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ تم کو ایسا کرنا کافی ہے اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور اپنے ہاتھوں کو جھٹکا اور آپ نے اپنے چہرے کا اور ہاتھوں کا مسح فرمایا۔

بہرحال تفقہ کے مذکورہ بالا دونوں شعبوں میں کسی فیصلے کے متعلق یکسوئی حاصل کرنے کیلئے خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطہر تھی جو نص قرآن نے اعلان کر دیا تھا کہ۔

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت

پھر قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جبتک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کراویں، پھر آپ کے

وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء ع ۱۰) | تعصبت دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کریں۔

دوسرے لفظوں میں گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ براہ راست حضرت حق سبحانہ تعالیٰ سے فیصلہ کرنیکا دروازہ وحی ونبوت کی راہ سے کھلا ہوا تھا وہ ہستی مسلمانوں میں موجود تھی جس کی نسبت قرآن ہی میں تھا کہ

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ع ۱) | وہ اپنی نفسانی خواہش سے نہیں کہتے ہیں ان کا ارشاد صرف وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

اسی کی دوسری تعبیر قرآن ہی میں ان الفاظ میں کی گئی تھی کہ

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ | جس نے رسول صلعم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی ہی طاعت کی

شرعی تعبیرات کے سمجھنے میں یا اپنی ضرورتوں کے متعلق حکم معلوم کرنے کیلئے آنحضرت صلعم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ پھر بسا اوقات ان کا جواب خود قرآن ہی میں براہ راست حق تعالیٰ اپنے کلام میں دیتے تھے "یَسْئَلُوْنَکَ" کے لفظ سے جو قرآنی آیتیں شروع ہوئی ہیں عموماً صحابہ ہی کے سوال کا جواب ان میں دیا گیا ہے اور کبھی آنحضرت صلعم اپنے الفاظ میں اسی جواب کو مسلمانوں پر پیش فرما دیتے جس کا علم آپ کو عطا ہوتا تھا۔ اسی کی تعبیر سنت کی جاتی ہے یا "الکتاب" کے مقابلہ میں "الحکمۃ" کا لفظ جو قرآن میں آتا ہے بعضوں کے نزدیک اسی "السنۃ" کا یہ قرآنی نام ہے۔

عہد نبوت میں تفقہ فی الدین کے دونوں شعبوں میں جو واقعات پیش آئے اور آنحضرت صلعم سے ان کے متعلق دریافت کیا گیا اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے گزشتہ اوراق میں جو خیط ابیض واسود والی اور جنابت سے تیمم والی حدیث پیش کی گئی ہیں وہ مقصد کو واضح کرنے کیلئے کافی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عہد نبوت میں جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے

كانت الاحكام تتلقى منه صلى الله عليه وسلم بما يوحى اليه من القرآن، و بينه بقوله وفعله لخطاب شفاهي۔ (مقدمہ ص۳۷۲) | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ بذریعہ وحی قرآنی احکام حاصل کرتے تھے اور آپ اپنے قول و فعل و بالمشافہ گفتگو سے لوگوں کی ضروریات کی تکمیل فرماتے تھے،

لیکن جب نبوت کا عہد سعادت ختم ہو گیا تو جیسا کہ اسی کے بعد ابن خلدون ہی نے لکھا ہے

ومن بعده صلوات الله عليه وسلامه تعذر الخطاب الشفاهي (مقدمہ ص۳۷۲) | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بالمشافہ مخاطبت سے تعذر دشوار کل ہو گیا

اس خطاب شفاہی کی سعادت سے محرومی کے بعد مسلمانوں کی شرعی زندگی کا ماوی و مرجع قدرتاً دو ہی

سرمایہ ہو سکتا تھا جب پہونچا کر اللہ کے رسول صلعم رفیق اعلیٰ کی طرف تشریف لیگئے تھے۔ یہ سرمایہ اور ذخیرہ جسے بطور متروکہ کے پیغمبر نے مسلمانوں میں چھوڑ اٹھا کیا تھا؟ یوں تو اس کی تحلیل و تشریح مختلف حیثیتوں سے کی گئی ہے لیکن اپنے مشہور "الرسالۃ" میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اس کا تجزیہ کیا ہے صحیح حقیقت کی یافت میں میرے نزدیک وہ بہترین تقسیم ہے۔ حضرت امام کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر صلعم نے مسلمانوں کے لیے جو کچھ چھوڑا ہے اس کا ایک حصہ تو وہ ذخیرہ ہے جسے امام شافعی اپنی زبان میں "ما نقلتہ عامۃ عن عامۃ" (ص ۱۲۴ الرسالہ) یعنی ایک گروہ دوسرے گروہ سے نقل کرے) مطلب یہ ہے کہ تواتر کے ساتھ مسلمانوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ تک اس طریقہ سے منتقل کرتا ہوا چلا آرہا ہو کہ اس میں شک کی قطعاً گنجائش نہ ہو جس میں سب سے پہلی چیز تو "الکتاب" اور قرآن ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ مومن غیر مومن مسلم غیر مسلم، ہر شخص اس یقین پر مجبور ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جسے خدا کے نام سے محمد رسول اللہ صلعم نے دنیا کو سپرد کیا ہے۔ جو مسلمان نہیں ہیں زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی طرف اس کتاب کا انتساب ان کے نزدیک مسلّم نہیں ہے لیکن اس میں کون شک کر سکتا ہے۔ کہ یہ وہی کتاب ہے۔ جسے آنحضرت صلعم نے خدا کے نام سے پیش کیا ہے اور "ما نقلتہ عامۃ عن عامۃ" یہ حال صرف قرآن ہی کا نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی شریعت کے سلسلے حقیقی عناصر اور اساسی حقائق غیر متزلزل یقین کے اسی قانون کے تحت آنحضرت صلعم سے منقول ہو کر موجودہ زمانے تک پہونچے ہیں۔

مثلاً نماز پانچ وقتوں کی فرض ہے، رمضان کا روزہ فرض ہے، نماز کی ہر رکعت میں دو سجدے ایک رکوع کا ہونا ضروری ہے، صبح کی فرض نماز دو رکعتیں ہیں، علیٰ ہذا القیاس دین کا بہت بڑا حصّہ قرآن کے سوا اسی "نقل عامۃ عن عامۃ" کی راہ سے ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک ہے اس طریقہ سے ایک نسل سے دوسری نسل تک، ایک طبقے نے دوسرے طبقہ تک ان اسلامی حقائق کو منتقل کیا ہے کہ مومن ہو یا کافر اس یقین کو اپنے اندر سے نکال نہیں سکتا کہ یہ ساری چیزیں وہی ہیں جس کی تعلیم پیغمبر نے مسلمانوں کو دی تھی۔

حضرت امام شافعیؒ، شریعت کے اس حصّہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

وھذا الصنف من العلم کلہ موجود نصافی کتاب اللہ جل ثناءہ و موجود عاما عند اھل الاسلام ینقلہ عوامھم عن من مضی من عوامھم یحکونہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الرسالہ ص ۹۶)

علم کی یہ صنف قرآن میں بصورت نص موجود ہے اور اہل اسلام کے ہاں بطور نقل عامہ بھی موجود ہے جن کو عوام کا ایک گروہ دوسرے گروہ عوام سے نقل کرتا ہے جو رسول اکرم صلعم سے منقول ہے۔

امام نے اسی علمی ذخیرہ کے متعلق لکھا ہے۔

علم عامة ما لا يسع بالغاً غير مغلوب على عقله جهله مثل ان الصلوات خمس وان على الناس صوم رمضان وحج البيت ان استطاعوا وزكاة في اموالهم وانه حرم عليهم الربوٰ والقتل والسرقة والزنا والخمر وكان في معنى هذا (ص ۹۶)

عام اُن چیزوں کا علم جن سے ناواقف رہنا کسی عاقل بالغ کے لیے جائز نہیں جیسے ہر روز پانچ نمازیں فرض ہیں اور لوگوں پر رمضان کے روزے اور استطاعت ہو تو خانۂ کعبہ کا حج اور ان کے اموال کا چالیسواں حصہ خیرات نا (زکوٰۃ) فرض ہے۔ سود کھانا، قتل کرنا، زنا کرنا اور شراب پینا حرام ہے اور اس طرح کی دوسری باتیں

مشہور حنفی امام امام ابوبکر جصاص المتوفی ۳۷۰ھ نے بھی اپنی کتاب احکام القرآن میں اسی حقیقت کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

قال اصحابنا ما كان من احكام الشريعة بالناس حاجة الى معرفته فسبيل ثبوته الاستفاضة والخبر الموجب للعلم

ہمارے بزرگوں (حنفی ائمہ) کا قول ہے کہ شریعت کے ایسے احکام جن کا جاننا عام لوگوں کیلیے ضروری ہے ان کے ثبوت کی شکل یہ ہے کہ عام طور پر علم پھیلا ہوا ہو۔ وہ خبر کے ایسے طریقے سے منتقل ہوا ہو جو آدمی میں ان کے یقینی اور قطعی علم کو ناگزیر کردیں۔

اسی ضابطہ کو دہراتے ہوئے دوسری جگہ جصاص یہی کہتے ہیں۔

كل ما بالناس اليه حاجة عامة فلا بد ان يكون من النبي صلى الله عليه وسلم توقيف الامة عليه

ہر وہ حکم جس کی عام لوگوں کو ضرورت ہو ناگزیر ہے کہ رسول اللہ نے کسی شخص کو نہیں بلکہ امت کو اس سے واقف کردیا۔

پھر یہ بات کہ جس کی عام لوگوں کو ضرورت ہوتی رہتی ہے۔ اس قسم کے احکام سے کیا مراد ہے۔ اسی کا جواب دیتے ہوئے وہی لکھتے ہیں۔

ذلك فيما يلزم الكافة ويكونون متعبدين فيه بفرض لا يجوز لهم تركه ولا مخالفته (ميل الفرقدين ص ۱۴۴)

اور یہ وہ احکام ہیں جو عام لوگوں کے لیے یا سب کے لیے جن کی تعمیل ضروری ہو اور فرض کے طریقے سے جن کی عبادت کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہو۔ اور یہ کہ جن سے گریز اور چھوڑنا یا ان کی مخالفت جائز نہ ہو۔

جس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہی ہوا کہ شریعت کے سارے ارکان وا جزائے کی حیثیت فرائض دو اجبات کی ہے۔ یہ سارا ذخیرہ جیسا کہ میں نے عرض کیا عہد نبوت سے اس وقت تک مسلمانوں میں اسی کیفیت کے ساتھ منتقل ہوا ہے جیسے قرآن قرآن پاک وہی کتاب ہے جسے محمد رسول اللہ صلعم نے پہونچایا ہے۔ جس راہ سے یہ یقین پیدا ہوا ہے اسی راہ سے

شریعت کا یہ حصّہ بھی منتقل ہوتا ہوا موجودہ نسلوں تک آیا ہے۔ جیسے قرآن کا ثبوت دغدغوں اور شکوک کی ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک ہے سچ پوچھیئے تو دین اسلامی کے سارے ضروری اجزا اور عناصر کا بھی بحمداللہ یہی حال ہے پس آنحضرت صلعم نے اپنے بعد جو دینی سرمایہ چھوڑا ایک حصّہ تو اس کا وہی نقل عامہ عن عامہ کے غیر منزلزل یقین پیدا کرنے والے فطری قانون کے تحت درج ہے آنحضرت صلعم کی طرف انکا انتساب مومن و غیر مومن ہر ایک کیلیے بدیہی اور قطعی ہے اور بقول امام شافعی کسی مجنون اور مغلوب علی عقلہ کے سوا لا یسع جہلہ''۔

دوسرا حصّہ اس متروکہ نبوی کے سرمایہ کا وہ ہے جس کی تعبیر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں "علم الخاصۃ سنۃ من خبر الخاصۃ یعرفہا العلماء (الرسالۃ ص۱۲۰)"

خود ہی دوسری جگہ اسی خبر الخاصۃ کی شرح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ

خبر الواحد عن الواحد حتی ینتھی الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم (الرسالۃ ص۹۹)	یعنی ایک شخص اس خبر کو کسی دوسرے شخص سے نقل کرتے ہوئے رسول اللہ صلعم تک پہونچا دے۔

بہرحال آنحضرت صلعم کے متروکہ سرمایہ کا ایک حصہ اس راہ سے بھی منتقل ہوا ہے اور جیسا کہ ابوبکر جصاص نے لکھا ہے کہ عموماً یہ وہی باتیں ہو سکتی ہیں جن میں

ما یلزم الکافۃ ویکونون متعبدین فیہ بفرض ولا یجوز لھم ترکہ ولا مخالفتہ	وہ احکام جو عام لوگوں کیلیے یا الکافۃ کے لیے جنکی تعمیل ضروری ہو اور فرض کے طریقہ سے انکا مطالبہ کیا گیا ہو اور انکے لیے انکا ترک کرنا یا مخالفت مسلمانوں کے لیئے جائز نہ ہو۔

کی کیفیت نہ پائی جاتی ہو وہ لکھتے ہیں کہ الکافۃ کیلیے جن امور کا لزوم مندرجہ بالا حیثیتوں کے ساتھ ہوگا۔

غیر جائز علیھا ترک النقل والاقتصار علی ما بنقلہ الواحد منھم نبذ الواحد (فی الفقہ ص۱۴۳)	تو تمام اُمت کے لیے اس کی نقلِ عمومی کا ترک کرنا اور ایک ایک شخص کی نقل پر اقتصار کرنا درست نہیں۔

جصاص نے ایک فقہی تمثیل سے بھی اس مسئلہ کو سمجھانا چاہا ہے یعنی رویت ہلال کے مسئلہ میں فقہا کا فتویٰ ہے کہ اگر مطلع صاف ہو تو اس وقت کسی ایک دو آدمی کی شہادت ثبوت رویت کیلیے ناکافی ہے لیکن اگر مطلع مکدر ہو مثلاً ابر آلود یا غبار آلود ہو تو اس وقت ایک دو آدمی کا دیکھنا بھی ثبوت کے لیے کافی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس میں بھی وہی بات ہے۔

اذا لم تکن بالسماء علۃ من الاصل الذی قلنا ان ما عمت بہ البلوی فسبیل ورودہ اخبار التواتر الموجبۃ للعلم واذا کان بالسماء	اسی اصل سے ہے جسکو ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ آسمان میں کوئی علت نہ ہو یعنی ابر آلود یا غبار آلود نہ ہو تو رویت کی تعمیم عموم بلوی کے لحاظ سے بذریعہ خبر تواتر ثابت ہوگی جو موجب علم ہے اور جب آسمان میں

علة فان مثله يجوز خفاؤه على الجماعة حتى لا يراه منهم الا الواحد والاثنان من خلل السحاب اذا انجاب عنه لم يستره قبل ان يتبينه الآخرون فلذلك قيل فيه خبر الواحد والاثنين ولم يشترط فيه ما يوجب العلم (ص۔۔ فصل القرتين)

کوئی علت ہو تو جماعت سے اس کا پوشیدہ رہنا ممکن ہے یہاں تک کہ ابر کی وجہ سے صرف ایک یا دو آدمی دیکھ سکتے ہیں اور جب ابر چھٹ جائے تب ان دوسرے لوگ دیکھنے تک آسمان پر باقی نہیں رہتا اسی لیے ایک آدمی یا دو آدمیوں کی اطلاع قبول کی جاتی ہے اور خبر تواتر (جو موجب علم ہو) شرط نہیں ہے۔

اپنے رسالہ میں امام شافعیؒ نے اس پر بڑی قوت سے دلیلیں قائم کی ہیں کہ خبر الخاصۃ سے اگرچہ اس قسم کا علم اور یقین تو نہیں ہو سکتا جو نقل العامۃ عن العامۃ کا فطری اور طبعی اثر ہے۔ لیکن عملی دنیا میں ہمیشہ اس قسم کی چیزوں پر بھی بھروسہ کیا گیا ہے نہ صرف عوام بلکہ حکومتوں کی مثال دے کر انہوں نے سمجھایا کہ

الولاة من القضاة وغيرهم يقضون وينفذون احكامهم ويقيمون الحدود وينفذون من بعدهم احكامهم واحكام اخبارهم۔ (الرسالہ ص۱۱)

والی اور قضاۃ وغیرہ فیصلہ کیا کرتے تھے اور ان کے احکام نافذ ہوتے تھے اور شرعی حدود جاری کیے جاتے تھے اور ان کے بعد بھی ان کے احکام جو بطور خبر پہنچتے تھے نافذ ہوتے تھے۔

انہوں نے آنحضرت صلعم کے خطوط کی مثالیں پیش کی ہیں جنہیں عموماً ایک قاصد لے جا کر دوسروں کو پہونچاتا تھا ان عمال اور والیوں کی مثال دی ہے جنہیں حضور صلعم مختلف علاقوں میں مقرر کر کے بھیجتے تھے اور لوگ اپنا حاکم تسلیم کر لیتے تھے انکے مطالبات ادا کرتے تھے بقول شافعیؒ یہ کبھی سننے میں نہیں آیا کسی نے کہا ہو کہ

انت واحد وليس لك ان تأخذ منا ما لم نسمع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول انه بعثك الينا (ص۱۱)

کہ تم تنہا ایک آدمی ہو تمہیں اس کا حق نہیں کہ ہم سے کچھ وصول کرو جبکہ ہم براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہ سن لیں کہ آپ ہی نے تم کو ہمارے پاس بھیجا ہے۔

تاہم جیسا کہ ابو بکر جصاص نے لکھا ہے کہ خبر الخاصۃ کی صورت عموماً انہیں میں اختیار کی گئی ہے جن کا تعلق عام فرائض و واجبات سے نہ تھا بلکہ بقول انکے یہ زیادہ تر ایسی باتیں تھیں جن کا کرنا بہتر ہوتا تھا اور نہ کرنے میں چنداں حرج بھی نہ تھا اور اس قسم کی چیزوں کو عامہ تک پہونچانے میں اسی لیے زیادہ کد و کاوش نہیں کی گئی کہ

ليس على النبي صلى الله عليه وسلم توقيفهم على النقل فيما خيرهم فيه (ص۱۴۳ فصل)

پیغمبر پر ان چیزوں میں جن میں عوام کو اختیار دیا گیا ہو نقل متواتر سے عامۃ الناس کو مطلع کرنا ضروری نہ تھا۔

بلکہ چند خاص لوگوں کو کہہ دینا بھی کافی سمجھا گیا جصاص نے اس قسم کی چیزوں کے ذیل میں لکھا ہے کہ

هذا سبيل ما ذكرت من امر الاذان والاقامة

منجملہ ان چیزوں کے جن کا ہم نے ذکر کیا اذان و اقامت کا حکم ہے

بتکبیرات العیدین والتشریق ومخیرهما من الامر الذی نحن مخیرون فیه لما انما الخلاف بین الفقهاء فی الافضل منهما فلذلک جاز ذ... وبعض الاخبار فیه من طرف الاحاد ویحمل الامر علی ان النبی صلی الله علیه وسلم قد فعل منه جمیع ذالک تعلیماً عنه وجه... ... ولیس ذالک مثل ما تلقوا واخذوا علیه وخطر علیهم مجاوزته وترکه الی غیره مع عموم البلوی (مقدمہ ابن خلدون)

عیدین و تشریق وغیرہ کی تکبیریں جیسی چیزیں جن میں ہمکو اختیار دیا گیا ہے اور فقہاء کرام کا اختلاف ان امور میں درصل ان اعمال کے افضل اور بہتر پہلو کے متعلق ہی ہے بعض حدیثوں کا خبر واحد کی شکل میں مروی ہونا جائز قرار پایا اور یہ سمجھا جائیگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتانے کے لیے کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے جس پہلو کو چاہیں مسلمان اختیار کرسکتے ہیں اپنے دونوں طرح کی باتوں پر عمل فرمایا لیکن ان چیزوں جیسا نہیں ہے جس کا مسلمان تلقی کرتے ہیں جن سے تجاوز کرنا مسلمانوں کیلئے ناجائز ہو اور عام طور پر لوگوں کو جن میں مبتلا ہونا بھی پڑے۔

بہرحال اسی خبر الخاصہ عن الخاصہ جس کا اصطلاحی نام "خبر الواحد عن الواحد" یا اخبار احاد ہے ان کے سوا بعض باتیں مسلمانوں کی پچھلی نسلوں میں پہلی نسلوں سے کچھ اس طریقہ سے منتقل ہوئی ہیں کہ گو بظاہر انکا انتساب صراحتاً اللہ اور اس کے رسول کی طرف نہیں کیا گیا ہے لیکن بغیر کسی اختلاف کے مسلمان یہ باور کرتے چلے آئے ہیں کہ یہ بھی ان کے دین کا جزو اور شرعی عناصر میں ہے اسی کا اصطلاحی نام اجماعی مسائل ہے۔

مثلاً یہی اخبار احاد وہ خبر الخاصہ کے متعلق جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے:

اجمع الصحابة رضوان الله علیهم اجمعین علی وجوب العمل بما یصل الینا عنها قولاً او فعلاً بالنقل الصحیح الذی یغلب علی الظن صدقه (مقدمہ)

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ جو چیز ہم تک قولی یا فعلی حیثیت سے نقل صحیح سے پہنچے اور اسکی سچائی پر ظن غالب ہو تو اس پر عمل کرنا واجب ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خبر الخاصہ کا وہ حصہ تصحیح کے مقررہ معیار پر جس کی صحت ثابت ہو چکی ہو اگرچہ خبر الواحد عن الواحد کی راہ سے ہم تک پہنچی ہیں اور اسی لیے ان سے ظاہر ہے کہ ظن غالب ہی پیدا ہوسکتا ہے لیکن بایں ہمہ ان کے مطابق عمل کرنا یہ ایسی بات ہے جس پر صحابہ کے اجماع نے خبر احاد سے ثابت شدہ چیزوں کو مسلمانوں کے دین کا جز بنا دیا ہے اس قسم کے مسائل جو اجماع کی راہ سے اسلامی شریعت میں داخل ہوگئے ہیں گو ان کی تعداد زیادہ تو نہیں ہے لیکن اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ چیزیں اس نوعیت کی ضرور پائی جاتی ہیں۔

شرعی مسائل جس سرمایہ سے ماخوذ ہیں انکی تحلیل فرماتے ہوئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شرعی خزانہ کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی ہے:

ما اجتمع المسلمون علیه وحکوعن من تبعهم الاجماع

اجماع وہ ہے جس پر مسلمانوں کا کسی مسئلہ پر اتفاق ہو چکا ہو اگرچہ کسی قرآنی آیت

علیہ وان لم یقولوا ھذا بکتاب ولا سنۃ | (لا کتاب) یا سنت کی وجہ سے اس کے قائل نہ ہوں

امام شافعی نے اس کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ گو بظاہر اجماعیات کا انتساب صراحۃً کتاب و سنت اور اللہ و رسول کی طرف نہیں کیا جاتا لیکن باوجود اس کے

فقد یقوم عندی مقام السنۃ المجتمع علیہا | یہ میرے نزدیک ایسی سنت کے برابر ہے جس پر لوگ مجتمع ہو چکے ہوں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اپنی قطعیت و یقین آفرینی میں ان کا حال بھی آنحضرت صلعم کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کے اس حصہ کا حال ہے جو نقل عامۃ عن عامۃ کی راہ سے ہم تک پہنچا ہے امام نے اپنے دعوے کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا:

وذالک لان اجتماعہم لا یکون عن رای | اور یہ اس لیے ہے کہ بزرگوں کا کسی چیز میں اتفاق محض رائے سے نہیں ہو سکتا۔

ابن خلدون نے امام کے انہیں الفاظ کی تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے

ولا یکون ذالک الا عن مستند، لان مثلہم لا یتفقون من غیر دلیل ثابت (ص مقدمہ) | اور ان کا اتفاق کر لینا بغیر سند کے نہیں ہو سکتا ان جیسوں سے یہ ممکن ہی کہ کسی غیر ثابت شدہ دلیل پر متفق ہو جائیں۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ تواتر سے صحابہ کے ایمانی حالات اور دینی شغف کی جن کیفیتوں کا علم ہم لوگوں کو ہوا ہے اس کے لحاظ سے یہ ناممکن ہے کہ اپنی طرف سے ان بزرگوں نے دین میں کسی چیز کا اضافہ کر دیا ہو اور وہ بھی ایسے طریقہ سے کہ سب کا اس پر اتفاق ہو یہ جانتے ہوئے کہ دین میں کسی چیز کے اضافہ کا حق اللہ و رسول کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ یہی تسلیم کرنا کہ صحابہ نے اپنی طرف سے کسی چیز کو دین بنا کر مسلمانوں کی شریعت میں داخل کر دیا ہے ہمارے اس یقین کو جھٹلاتا ہے جو تواتر کی راہ سے صحابہ کے متعلق ہمارے اندر پیدا ہو چکا ہے۔

اجماع سے ثابت شدہ مسائل کو بھی شریعت کا صحیح ماخذ قرار دینے پر خود امام شافعی اور ان کے سوا دوسرے بزرگوں نے اور بھی دلائل قرآن و سنت سے پیش کیے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں حاجت نہیں۔

اس وقت مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ اختلاف کی گنجائش جیسے عہد نبوت میں ان دو شعبوں میں پیدا ہو سکتی تھی یعنی شرعی تعبیروں سے شارع کے صحیح منشا تک پہنچنا اور منصوص سے غیر منصوص حوادث و نوازل کے متعلق نئے احکام پیدا کرنے میں اختلاف پیدا ہو سکتا تھا وہ تھا اسی طرح آنحضرت صلعم کے بعد اختلاف کا ایک میدان یہی خبر الخاصہ عن الخاصہ یعنی خبر احاد سے ثابت شدہ مسائل و نیز دوسرا میدان ان مسائل کے متعلق پیدا ہوا جن کے متعلق دعوے کیا جاتا ہے کہ وہ اجماع سے ثابت ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ خبر الواحد عن الواحد کے متعلق جیسا کہ امام شافعیؒ کے حوالہ سے گزر چکا کہ عملی دنیا کا زیادہ دارومدار اسی پر ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہر ایسی چیز جو کسی ایک سے ایک کو پہنچی ہو ہر حال میں تو قابل بھروسہ نہیں ہوتی بلکہ بیان کرنے والے

خصوصیات اُنکی سیرت کردار، دل و دماغ، سمجھ بوجھ، یادداشت کی قوت، پوزیشن وغیرہ بیسیوں باتیں دیکھی جاتیں ہیں اور انکے سوا بھی دوسرے حالات و قرائن پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب جاکر اس قسم کے خبرالخاصہ پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اب یہی شروط اور خصوصیات کے متعلق مختلف جانچ والوں میں اختلاف کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات ہے اس کے علاوہ اس قسم کی خبروں میں جب عمومیت کا رنگ پیدا نہیں ہوا بلکہ بعض خاص افراد تک انکا علم محدود تھا اور ان سے بعض افراد ہی نے سنا ایسی حالت میں کسی کو انکا علم ہوا اور کسی کو نہ ہوا اگر ایسی صورت پیش آجائے تو اس میں کیا تعجب ہے۔ اور یہ دوسری بنیاد اس اختلاف کی ہے جو خبرالخاصہ عن الخاصۃ کی وجہ سے پڑ گئی۔ اور یہی حال اجماع کا بھی ہے۔ یہ مان لینے کے بعد کہ جو مسائل اجماع سے ثابت ہوں خواہ صراحۃً پیغمبر کی طرف انکا انتساب نہ کیا گیا ہو لیکن مسلمانوں کا اس پر اتفاق کہ وہ ان کے دین کا جزء ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ وہ پیغمبر ہی سے ماخوذ ہیں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن مسائل کے متعلق اجماع کا دعویٰ کیا جاتا ہے واقع میں تمام مسلمانوں کا ایسا اتفاق ہوا بھی ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان بات نہیں ہے یہی اسباب ہوئے جن کی وجہ سے نبوت کے بعد شرعی مسائل کے متعلق اختلاف کے یہ دو دروازے کھلے۔ جیسے جیسے زمانہ آگے کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا گزشتہ دونوں شقوں کی لحاظ سے بھی اور ان اختلافی اسباب کی وجہ سے بھی مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہونے لگا۔

اختلافات کے وقت کا چارہ کار | اختلافات کی یہ صورتیں جو آئندہ پیش آنے والی تھیں ظاہر ہے کہ اس سے اگر خدا واقف نہ ہوتا تو کون ہوتا اس لیے اسی زمانہ میں جب مسلمانوں میں پیغمبر صلعم موجود تھے، انبوی سعادتوں سے محرومی کے بعد اس قسم کے اختلافات کی صورت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے قرآن ہی میں چارہ کار بتا دیا گیا تھا قرآن کی اس آیت

وَاِذَا جَاۤءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ اِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (النساء ع ۱۱)

اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن کی ہو یا خوف کی تو اسکو مشہور کر دیتے ہیں اگر یہ لوگ اسکو رسول (صلعم) اور جو ان میں سے ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے حوالے رکھتے تو اسکو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو انمیں اسکی تحقیق کر لیا کرتے ہیں۔

سے علماء نے سمجھا ہے کہ ایسے معاملات میں جن سے مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو جیسا کہ ہر طرح کی خبروں کے پھیلانے کی وجہ سے بسا اوقات شدید فتنوں کا دروازہ کھل جاتا ہے جب الرسول موجود ہو تو انکی طرف رجوع کیا جائے اور جب وہ نہ ہوں تو مسلمانوں میں امر اور حکم دینے کا اقتدار جن لوگوں کو حاصل ہو ان لوگوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ پھر قرآن نے یہ اضافہ کر کے کہ جن لوگوں میں واقعات و خبروں سے صحیح نتائج حاصل کرنے کا سلیقہ ہوگا وہ اصل حقیقت تک پہونچ جائینگے اور حقیقت کو جان لیں گے یعنی "لعلمه الذين يستنبطونه"

منہم،، کے الفاظ کا جو حاصل ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امر اور حکم دینے کا اقتدار قرآن ان ہی لوگوں کو عطا کرتا ہے جن میں اس قسم کی استنباط کا ملکہ اور سلیقہ ہو اور یہی وجہ تھی کہ دوسری جگہ قرآن نے اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے یعنی "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کے بعد اس نے "واولی الامر منکم" کا اضافہ اسی لیے کیا کہ "الرسول" کے بعد اس قسم کے اختلافی مسائل میں مسلمانوں کو امر اور حکم دینے کا حق ان کو حاصل ہوگا۔

اور ہوا بھی یہی کہ آنحضرت صلعم کے بعد اس قسم کے معاملات میں مسلمانوں نے اپنے آپ کو ان بزرگوں کے سپرد کیا جن میں استنباطی ملکہ کے ذریعہ سے واقعات کے علم کا سلیقہ تھا۔ حالانکہ آنحضرت صلعم کے عہد مبارک میں صحابہ کی مقدار ایک لاکھ سے متجاوز تھی۔ اس سے قیاس کرنا چاہیے کہ عام مسلمانوں کی تعداد کیا ہوگی! اور آپ کے بعد تو اضعافاً مضاعفہ مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی جاتی تھی، لیکن نبوت کے بعد جب صحابہ کا عہد آیا تو شرعی مسائل میں مسلمانوں نے ان ہی صفات کے چند خاص بزرگوں پر اعتماد کر لیا تھا جن میں ممتاز ترین ہستیاں بقول ابن قیم حسب ذیل حضرات کی تھیں۔

عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود۔ عائشہ ام المومنین، زید بن ثابت
عبداللہ بن عباس۔ عبداللہ بن عمر (اعلام الموقعین ص۹)

بعض سربرآوردہ اصحاب مثلاً حضرت ابوبکر، معاذ بن جبل رضی اللہ تعالے عنہما کا نام اس سلسلہ میں اس لیے نہیں لیا جاتا ہے کہ ان بزرگوں کی وفات آنحضرت صلعم کے تھوڑے ہی دن بعد ہو گئی اور بعض ایسے بھی تھے جن میں گو خدا نے استنباط کا سلیقہ پیدا بھی کیا تھا لیکن دوسرے مشاغل نے شریعت کے اس پہلو کی طرف ان کو متوجہ ہونے کا موقع نہ دیا۔

اسی زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا اور مدینہ سے نکل کر اسلام اقطار ارض میں پھیل گیا اب مدینہ منورہ کے ساتھ چند اور شہروں کو بھی مرکزیت کا مقام حاصل ہوا جنہیں مکہ۔ کوفہ۔ بصرہ۔ مصر۔ دمشق۔ یمن کو خاص امتیاز حاصل تھا عہد صحابہ کے بعد اب ہر اسلامی مرکز کے مسلمانوں نے اپنے اپنے شہر کے امر اور حکم دینے والے ان علما کو جو استنباط اور اجتہاد کا کام کرتے تھے مرجع بنا لیا اس زمانے میں ان لوگوں کا نام "اصحاب فتوی" اجتہاد، ہو گیا۔ میرے سامنے اس وقت تفصیل نہیں ہے۔ اجمالاً اتنا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ عہد صحابہ کے بعد مدینہ منورہ میں سعید بن المسیب۔ عروہ بن زبیر۔ قاسم بن محمد۔ خارجہ بن زید۔ ابوبکر بن عبدالرحمن۔ سلیمان بن یسار۔ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ۔ ان سات بزرگوں نے اولوالامری میں خاص شہرت حاصل کی۔ اسی لیے فقہاء سبعہ کے نام

سے مشہور ہے مسلمانوں میں ان بزرگوں کی ہستیوں نے اس قدر احترام حاصل کیا کہ ان کے ناموں کو ایک شعر میں جمع کر دیا گیا ہے جو یہ ہے۔

اذا قیل من فی العلم سبعة ابحر ❊ روایتهم لیست عن العلم خارجة
فقل هم عبید الله عروة قاسم ❊ سعید ابو بکر سلیمان خارجة

اور کہا جاتا ہے کہ

ان اسماء فقهاء السبعة الذین کانوا بالمدینة الشریفة اذا کتبت فی رقعة وجعلت فی القمح فانه لا یسوس مادامت الرقعة فیه (خزائن الاسرار ص۳ للعلامہ نور شاہ الکشمیری)

فقہاء سبعہ کے اسماء جو مدینہ شریف میں رہتے تھے جب کسی کاغذ پر لکھ کر گیہوں میں رکھے جائیں تو اس کاغذ کے رہنے تک ان کو کیڑے نہیں چھوتے

اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ

ان اسماءهم اذا کتبت وعلقت علی الراس او ذکرت علیه زال الصداع العارض (ص۳)

ان حضرات کا نام جب لکھ کر سر پر باندھیں یا پڑھ کر دم کریں تو سر کا درد زائل ہو جاتا ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ ان اسماء کی اس خصوصیت کو کوئی مانے یا نہ مانے بلکہ بتانا صرف اسی قدر ہے کہ عام مسلمانوں میں ان کے ساتھ اعتماد اور عقیدت کی جو کیفیت تھی اس کا اس سے اندازہ ہوتا ہے اور ان لوگوں کیلئے یہ سوچنے کی بات ہے جو سمجھتے ہیں کہ مجتہدین اور علماء کی تقلید مسلمانوں میں ایک نئی بات ہے عہد نبوت اور صحابہ میں نہ تھی فقہاء سبعہ کے بعد بھی مدینہ میں مسلمانوں کی شرعی اور دینی زندگی سے متعلق امر و حکم کا اقتدار ان ہی چند مخصوص ہستیوں ہی تک محدود ہا جن میں وہی قرآنی صفت یعنی استنباطی اور اجتہادی قوت کے ذریعہ سے حقیقت تک پہنچنے کا ظن غالب سمجھا جاتا تھا کہ طبقہ بہ طبقہ بالآخر یہی اقتدار اپنے زمانہ میں دار الہجرت کے امام۔ امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک منتقل ہوتا ہوا پہنچا اور جو مدینہ کا حال تھا وہی حال مکہ معظمہ، بصرہ، کوفہ، شام، مصر، یمن وغیرہ سب ہی بلاد و امصار کا تھا جو اسلامی فتوحات کے بعد مسلمانوں کے مرکزی مقامات کی حیثیت حاصل کر چکے تھے مکہ معظمہ میں عطاء بن ابی رباح، طاوس، عکرمہ مولیٰ ابن عباس تابعین کا پہلا طبقہ تھا جنکی تقلید مکہ کے مسلمان کرتے تھے انہی بزرگوں کے جانشین سعید بن سالم القداح، مسلم بن خالد زنجی فقہائے مکہ تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مکہ میں

لہ جامعہ الاستاذ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ (جن کے زیر نگرانی یہ مقالہ تیار کر رہا ہوں) نے ارشاد فرمایا کہ بعض لوگ کرتے تھے۔ معروف جمع کر دیا گیا تھا ان کا بیان ہے کہ جب تک کاغذ غلہ میں رہا وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ ہے کہ کیڑے وغیرہ اس میں نہیں لگے۔

ان ہی مسلم بن خالد ہی سے تعلیم حاصل کی تھی۔

کوفہ میں سب جانتے ہیں کہ عہد صحابہ کے بعد علقمہ، اسود، مسروق، قاضی شریح یہی چند گنے چنے اشخاص تابعین کے پہلے طبقہ میں مرجع انام تھے۔ انکے بعد ابراہیم نخعی، عامر شعبی وغیرہم بزرگوں کا زمانہ آیا نخعی اور شعبی ہی کے فیض یافتوں میں سلیمان، اعمش، مسعر بن کدام، حماد بن ابی سلیمان تھے امام ابوحنیفہ نے اجتہاد واجتہاد کے ملکہ کی مشق زیادہ تر حماد بن ابی سلیمان ہی کی صحبت میں حاصل کی تھی بصرہ میں پہلا طبقہ صحابہ کے بعد خواجہ حسن بصری اور ابن سیرین وغیرہ کا تھا، ان کے بعد ایوب سختیانی سلیمان تیمی قتادہ اور ان کے بعد قاضی سوار عثمان البتی، بصرہ کی امامت کے مالک ہوئے۔ چونکہ اس وقت میرے سامنے ہر ہر شہر کے ائمہ اور فقہا کی تاریخ کی تفصیل نہیں ہے۔ اس لیے ان چند اجمالی اشاروں پر کفایت کرتے ہوئے اصل مقصد کی طرف رجوع ہوتا ہوں میں یہ کہہ رہا تھا کہ اختلافات کے اس اوسع روکنے کی ممکن اور واقعی صحیح تدبیر یہی ہو سکتی تھی جسکی تعلیم قرآن نے مسلمانوں کو دی تھی اور خدا کا ہزار شکر ہو کہ مسلمانوں نے اس قرآنی تدبیر کے اختیار کرنے میں کسی زمانہ میں کبھی کوتاہی نہیں کی، جاہلی حمیت یا بیجا غیرت نے ان کو کبھی اس پر آمادہ نہیں کیا کہ بجائے اپنی رائے کے اپنی دینی زندگی میں دوسروں کی تقلید کا طوق اپنے گلے میں کیوں پہنیں، آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ صحابہ کرام جنھیں خود نبوت کی صحبت کی سعادت براہ راست حاصل تھی قرآن جن کی زبان میں اور جن کے سامنے نازل ہوا تھا ان کی زبان بھی وہی تھی جو پیغمبر صلعم کی زبان تھی لیکن باینہمہ یہی صحابہ بجائے اپنی رائے پر عمل کرنے کے یہ نہیں کہ کسی فقیہ صحابی کی تقلید کرتے تھے بلکہ شرف صحبت سے جو محروم تھے لیکن مردِ علم کیلئے جس صفت کی ضرورت قرآن نے بتائی تھی چونکہ ان میں پائی جاتی تھی اس لیے صحابہ بھی بسا اوقات ضرورت کے وقت ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو شرف صحبت سے فیض یاب نہ تھے۔ الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں علقمہ امام اہل الکوفہ کے حال میں لکھا ہے۔

قال قابوس بن ابی ظبیان قلت لابی لای شی کنت تدع الصحابۃ وتاتی علقمۃ قال ادرکت ناسا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھم یسألون علقمۃ ویستفتونہ (ص۴۳)

قابوس بن ابی ظبیان نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ صحابہ کرام کو چھوڑ کر علقمہ کے پاس کیوں آتے تھے تو انھوں نے کہا کہ میں نے چند نبی کے اصحاب کو دیکھا کہ وہ بھی علقمہ سے مسائل پوچھتے اور فتوے لیتے تھے،

ہر ہر شہر کے مسلمانوں کا چند خاص شخصیتوں پر اعتماد کر لینے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ پہلی صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی

او فقہاء صحابہ میں چند ہستیاں ایسی تھیں کہ بقول ابن حزمؒ

یمکن ان یجمع من فتوی کل واحد منہم سفر ضخم (ص۵ اعلام) | ان میں سے ہر ایک کے فتووں کو ضخیم کتابوں میں جمع کیا جا سکتا ہے۔

خصوصاً ابن عباسؓ جنہوں نے کافی طویل عمر پائی ان کو اپنی زندگی میں اتنے سوالوں کا جواب دینا پڑا کہ

جمع محمد ابن موسی بن یعقوب بن امیر المومنین المامون فتیا ابن عباس فی عشرین کتاباً (ص۹ اعلام) | محمد بن موسیٰ ابن یعقوب ابن امیر المومنین المامون نے ابن عباس کے فتووں کو بیس کتابوں میں جمع کیا۔

• اللہ اعلم کتاب سے کیا مراد ہے۔ اور ہر کتاب کی ضخامت کیا تھی لیکن خواجہ حسن بصریؒ جن کی وفات ۱۱۰ھ ہجری میں ہوئی ابن قیم نے تو ان کے متعلق تصریح کی ہے۔

قد جمع بعض العلماء فتاویہ فی سبعۃ اسفار ضخیم (ص۹ ۱) | بعض علماء نے انکے فتووں کو سات ضخیم کتابوں میں جمع کیا ہے۔

اس باب میں ملت اسلامیہ نے کس حد تک رواداری اور مصلحت اندیشی سے کام لیا ہے اس کا اندازہ آپکو اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہ کے بعد ان کی تمام مرکزی مقامات میں عموماً ان ہی لوگوں کو مسلمانوں نے اپنا امام اور پیشوا بنالیا تھا جو عام طور پر طبقہ موالی سے تعلق رکھتے تھے۔[۱]

خالص قریشی نژاد عربوں کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی کہ وہ ان لوگوں سے اپنے دین میں مشورہ لے رہے ہیں جو خود یا انکے باپ دادا انکے غلام رہ چکے تھے۔ یہ وہی قریش اور وہی عرب تھے جو غیروں کے ساتھ خدا کی عبادت کرنے میں اپنی آبروریزی سمجھتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ غلاموں کے ساتھ دفن ہونے میں جن کو اپنی ہتک کا احساس ہوتا تھا لیکن آج قرآن نے انہی کی آئندہ نسلوں کو اتنا نرمایا ہے کہ اپنی تمام خود بینیوں اور خود رائیوں سے دستکش ہو کر ان ہی کے قدموں پر جھکے ہوئے ہیں جنکے آگے ان حالات میں قرآن نے جھکنے کا انکو حکم دیا تھا۔

اور پہلی صدی ہجری تک تو طبقہ موالی میں بھی چونکہ ابھی خاصی تعداد ارباب فقہ و افتاء یا اجتہاد و استنباط کی پیدا ہو رہی تھی اسلیے ہر ہر شہر اور علاقہ میں متعدد ہستیاں ایسی پائی جاتی تھیں جنکو دینی مشاغل میں امر و حکم کا اقتدار مسلمانوں کی طرف سے ملا ہوا تھا لیکن جیسے جیسے زمانہ آگے کی طرف بڑھ رہا تھا مختلف اسباب و وجوہ ذوق علم اور جذبۂ جستجو کو کم کرتے

---

۱ اور اس کی کھلی ہوئی وجہ یہ تھی کہ فتوحات کی وسعت، مقبوضات کی کثرت نے عرب خصوصاً قریش کو زیادہ تر سیاسی اور عسکری مشاغل میں الجھا رکھا تھا ان ہی مصروفیت کی وجہ سے ان کے پاس اتنی فرصت کہاں تھی کہ علمی و فکری کاموں کیلیے وقت نکالیں بخلاف موالی کے جن میں عموماً غلام خاندان کے ایسے افراد تھے جو اپنے ملک اور قبیلے سے الگ ہو کر مسلمانوں کی آبادیوں میں بس گئے تھے۔ قدرتی طور پر حکومت کے معاملات میں انکو دخل کم تھا ان کو علمی میدان میں آگے بڑھنے کا موقع مل گیا اسی ایک واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت زید بن ثابتؓ کے موالی میں تھے لکھا ہے کہ ان کو سات سو صحابہ سے ملنے جلنے اور استفادہ اور انتفاع کا موقع ملا اور تقریباً یہی حال طبقہ اولیٰ کے دوسرے تابعین کا تھا۔

پڑ جاری تھے استنباط اور اجتہاد کے ملکات سست پڑتے جاتے تھے معیاری شخصیتوں کی پیداوار دن بدن گھٹتی چلی جا
رہی تھی ذہنی انحطاط، فکری جمود و خمود، علمی تنزل و پستی کا یہ حادثہ یقیناً ایک ناخوش گوار حادثہ تھا لیکن قدرت
نے اسی شر کو عجیب بات ہے کہ ایک خیر عظیم کا ذریعہ بنا دیا۔

مطلب یہ ہے کہ دن بدن اجتہادی ملکات کی تنزل پذیری کے شعوری یا غیر شعوری احساس نے مسلمانوں کے
فہم عمومی میں یہ میلان پیدا کرنا شروع کیا کہ دینی و شرعی مسائل کے امر و حکم کے اقتدار کے دائرہ کو گھٹاتے ہوئے ان
چند شخصیتوں تک محدود کر دیں جن میں پہلی صدی ہجری کے بعد استنباط و اجتہاد کا تجربہ کیا جا رہا تھا یعنی کہ اسی
میلان نے ترقی کرتے ہوئے ابتدائی صدیوں ہی میں اسلامی ممالک میں وحدت کا عجیب و غریب رنگ پیدا کیا
کہ ایک ایک علاقہ کے مسلمان سمٹ سمٹا کر باوجودیکہ کروڑہا کروڑ کی تعداد میں تھے لیکن بجائے کسی تشتت و اختلاف
کے کسی ایک مسلّم بین الانام امام پر اکٹھے ہوگئے اور بحمد اللہ ایک شر سے پیدا ہونے والی اسی خیر عظیم کا یہ قابل صد
ہزار شکر نتیجہ ہے کہ کرۂ زمین کے چالیس پچاس کروڑ باشندوں یعنی امت اسلامیہ کی اکثریت کبیرہ یعنی اہل السنۃ
والجماعت کل چار اماموں پر متفق ہو گئی ہے۔ اور چار بھی، انکی تعداد اس وقت ہوتی ہے جب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ
کے ماننے والوں کی اس تھوڑی تعداد کو بھی ہم اس میں شریک کر لیں جو خال خال اسلامی ممالک کے بعض مخصوص
علاقوں میں پائے جاتے ہیں ورنہ سچ پوچھیے تو تعداد کی کثرت کے حساب سے یہ چار کی تعداد بھی دو یعنی امام ابو حنیفہؒ
اور امام مالکؒ پر ختم ہو جاتی ہے ان دونوں کے بعد شافعیوں کی بھی ایک معقول تعداد ہے۔ چالیس پچاس کروڑ بلکہ اگر
مجلس اقوام کی تازہ ترین تحقیقی رپورٹ کا اعتبار کیا جائے تو ستر اکہتر کروڑ کے لگ بھگ جس قوم کی دنیا میں
تعداد ہو انکی بڑی اور بہت بڑی اکثریت کا ان تین چار اماموں پر متفق ہو جانا یقیناً اسلام کے سیکڑوں معجزات
میں ایک معجزہ ہے اور وہ بھی حال کی عام صورت یہ نہیں ہے کہ ہر ہر ملک میں ان دو تین اماموں کے اتباع ملے
جلے پائے جاتے ہوں کیونکہ اگر یہ شکل بھی ہوتی تو زمین کے باشندوں کی اتنی بڑی تعداد کا دو تین فرقوں پر تقسیم
ہو کر رہ جانا خود عجیب بات تھی خصوصاً یہ فرقہ بندی بھی جس نوعیت کی ہے اس پر فرقہ بندی اور اختلاف
و تحزب کا اطلاق بھی صحیح معنوں میں درست نہیں، آج ہی سے نہیں ابتدا سے اہل السنۃ والجماعت کے یہ
طبقات یعنی حنفی، مالکی، شافعی و حنبلی کا یہ حال ہے کہ ہر ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، تعلیم و تعلم ہی نہیں

لے اور اسکی وجہ یہی ہوئی کہ بتدریج عربوں کی سوسائٹی میں موالی کو بھی ابھرنے کے مواقع جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا زیادہ ملتے گئے۔ تا آنکہ ابتدائی
سیاسی چند پشتوں کے بعد مسلمانوں کی سیاسیات کا ایک اہم عنصر بن گیا۔ بڑے بڑے کشوری اور فوجی عہدوں پر انکا بھی قبضہ ہو گیا۔
جس طرح عربوں کو ان ہی سیاسی مشاغل نے علم سے دور کر دیا تھا اسی مصیبت کے شکار یہ بھی ہوئے یکسوئی کے ساتھ علم و دین کی خدمت
کا جو ذوق ان کے طبقات اولی میں پایا جاتا تھا انہیں انحطاط پذیر ہونا پڑا۔

بلکہ بیعت و ارشاد میں بھی ایک گروہ کے افراد دوسرے گروہ کے بزرگوں کے مرید ہوتے تھے اور اب تک ہوتے ہیں جس کی عمومی مثال یہ ہے کہ تمام سنی مسلمانوں کے متفق علیہ روحانی پیشوا الشیخ المشائخ سید نا شیخ عبدالقادر الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہے سب جانتے ہیں کہ حضرت حنبلی تھے لیکن جہاں تک میرا بیان ہے حنابلہ سے زیادہ ان کے معتقد حنفی اور شافعی مسلمان ہی نظر آتے ہیں۔ شاذلی، رفاعی، حالانکہ شافعی ہیں لیکن حنفی مسلمان ہوں یا مالکی ہر ایک ان بزرگوں کی امامت پر متفق ہے۔ مولانا جلال الدین رومی، مجدد الف ثانی حنفی المشرب حضرات ہیں لیکن آج کوئی شافعی ایسا ہے اور نہ مالکی جو رومی کو اور انکی مثنوی کی ستائش میں رطب اللسان نہ ہو، مجدد الف ثانی گو پچھلے زمانے کے بزرگوں میں ہیں لیکن جیسے جیسے انکی شہرت کا دائرہ اسلامی ممالک میں وسعت اختیار کر رہا ہے ہر طبقہ کے مسلمان انکی عقیدت کا حلقہ آویزہ گوش بنا رہے ہیں۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی میں کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں کے یہ دو چار گنے چنے نام نہاد کے مجازی فرقے عموماً کسی ایک ملک میں نہیں پائے جاتے بلکہ انہیں سے ایک مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔ اور ان چیزوں نے بڑی حد تک اس مجازی فرقہ بندی کے سوال کو بھی ختم کر دیا ہے، جو بظاہر ایک ہی جگہ میں ان مختلف فرقوں کے پائے جانے کی صورت میں ہوتا تھا۔ سب سے بڑی تعداد تو حنفی مسلمانوں کی ہے اس کے بعد درجہ مالکیوں کا ہے مالکیوں کے بعد جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے شوافع ہیں اور بہت تھوڑی تعداد حنابلہ کی ہے، عصر جدید کے مشہور ادیب و مصنف علامہ امیر شکیب ارسلان نے حسن المساعی فی سیرۃ الاوزاعی کے تعلیقات میں امام ابو حنیفہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا

واتباع مذھبہ اکثر المسلمین فالترک جمیعھم و مسلمو بلاد البلقان و مسلمو الروسیۃ و مسلمو افغانستان و الھند و الصین و اکثر مسلمی العرب فی الشام والعراق فی الفقہ علی مذھب الحنفیۃ والاکثر اھل سوریہ والحجاز و الیمن والحبشۃ جمیع بلاد جاوی واکثر اھل الکردیہ یقلدون الامام الشافعی والمالکیۃ واھل غربی افریقیا واواسط افریقیۃ ولبعض اھل مصر یقلدون امام

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پیروی کرنے والے اکثر مسلمان ہیں تمام ترک، ممالک بلقان کے، ممالک روس کے مسلمان نیز افغانستان ہند، چین، شام، عراق، اور عرب کے اکثر مسلمان فقہ حنفی کے پابند ہیں۔ شام کے مسلمانوں کا بڑا طبقہ حجاز، یمن، حبشہ، تمام جزائر جاوہ اور کرد امام شافعی کی تقلید کرتے ہیں، مغربی و وسطی افریقہ کے باشندے اور اہل مصر کے بعض مسلمان دار الہجرت کے امام مالک بن انس کی پیروی کرتے ہیں اہل نجد اور شام و نابلس مدرومہ احمد بن حنبل کی اتباع کرتے ہیں۔

دار الھجرۃ مالک بن انس و اھل نجد و بعض اھل سوریۃ واھل نابلس یقلدون احمد بن حنبل (ص ۲۹ حسن المساعی)

کتنا جاں پرور اور انسانیت کا مہذب نظریہ ہے۔ ایک طرف غیر اسلامی اقوام کو دیکھیے کہ ایک ایک ملک بلکہ ایک ایک صوبہ میں ان کے بیسیوں فرقے اور جتھے ایسی شکلوں میں پائے جاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے گویا ہر ایک اپنے سوا دوسروں کو نوعِ انسانی سے بھی خارج سمجھتا ہے لیکن یہ اسلام کی تعلیمات کا اعجاز ہی تو ہے جس نے زمین کی اتنی بڑی آبادی کو وحدت کے ایک ہی رنگ میں رنگ دیا اور ایسی پائدار وحدت جو بحمد اللہ تیرہ سال سے ایک حالت پر قائم ہے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہوں جوں جوں زمانہ نے قدم آگے بڑھایا وحدت کا یہ رنگ مسلمانوں میں اور گہرا ہوتا چلا گیا۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب مختلف قوموں سے نئے نئے لوگ اسلام میں داخل ہوئے افتراق و تحزب کی ذہنی عادتوں کا اثر ابھی تمام کچھ باقی رہ گیا تھا غالباً یہی وجہ تھی کہ شروع ہی میں مسلمانوں میں کافی فرقے نظر آنے لگے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (آل عمران ع)

اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہونا جنہوں نے باہم اپنا کو الگ کر لیا اور اختلاف ہو گئے کھلی کھلی باتوں کے آنے کے بعد یہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران ع)

اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو باہم ایک دوسرے سے جدا جدا مت ہو جانا اور تم پر اللہ تعالیٰ کا جو انعام ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی بس ہو گئے تم اللہ تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (الانفال ع)

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو اور باہم نزاع مت کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

اس قسم کے شدید قرآنی مطالبوں کی مسلسل چوٹ نے ان کے موروثی اثرات کو بالآخر مضمحل کر دیا اور بحمد اللہ اسلام اپنے پیغام وحدت میں بالآخر کامیاب ہو کر رہا۔ امیر شکیب ارسلان نے بھی لکھا ہے:۔

ولم یبق عند اهل السنة من المسلمین سوی المذاهب الاربعة الحنفی والشافعی والمالکی والحنبلی (ص ۶۹ حسن المساعی)

اہل سنت مسلمانوں میں چار مذاہب حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کے کوئی دوسرے فرقے باقی نہیں رہے

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی ایک قلیل تعداد ایسی بھی ہے جو اہل السنۃ والجماعت میں شریک نہیں ہے لیکن ان فرقوں کی تعداد بھی کیا دہ میں ہے کتابوں میں اس زمانے کے تاریخی فرقوں کا جو ذکر کیا جاتا ہے (جس وقت مختلف قومیں مختلف ملکوں کی اسلام میں داخل ہوتی تھیں) تو لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ اب بھی مسلمانوں میں شاید یہ عجیب غریب فرقے موجود ہیں حالانکہ

واقعہ یہ ہے کہ اول تو ابتدائی صدیوں میں جس فرقے نے مسلمانوں میں بہت زور پکڑ لیا تھا بڑے بڑے سلاطین اور امرا کو بھی جس نے ہمنوا بنا کر ایک طرف تو تلوار کے زور سے کام لینے کی اس نے پوری کوشش کی زبان و قلم کے تو وہ مرد میدان تھے ہی میری مراد معتزلہ سے ہے لیکن آج معتزلہ تو معتزلہ ان غریبوں کی کسی کتاب کے ایک ورق کا بھی دنیا کے کسی حصہ میں کوئی نشان باقی نہیں ہے اور تقریباً یہی حال تمام فرقوں کا ہو گیا جن کا حال ہم "ملل و نحل" کی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔

غیر سنی فرقوں میں شیعوں کے سوا اگر بہت زیادہ جستجو و تلاش سے کام لیا جائے گا تو جیسا کہ سننے میں آتا ہے، خارجیوں کا ایک گروہ عرب کے بعض ساحلی مقامات مثلاً مسقط وغیرہ میں پایا جاتا ہے جن کی تعداد بمشکل چند لاکھ سے متجاوز ہو گی۔ پس سچی بات یہی ہے کہ سنیوں کے بعد اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں میں اگر کوئی فرقہ قابل ذکر رہ جاتا ہے تو وہ صرف شیعوں اور انہی کے مختلف احزاب ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے دنیا کے مسلمانوں کے مقابلہ میں شیعوں کی تعداد کسی حیثیت سے بھی قابل لحاظ ہو سکتی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ دس میں ایک کی نسبت سے بھی وہ پائے جاتے ہیں۔

آپ خود ہی کہیے کہ ستر کروڑ والی قوم میں اگر ایک دو فرقوں کی تھوڑی بہت تعداد پائی بھی جاتی ہو تو یقیناً اس سے اس قوم کی وحدت اکثریہ مجروح نہیں ہوتی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اپنے موضوع بحث سے کچھ دور ہٹ گیا لیکن ایک بڑے خطرناک عصری فتنہ نے بیساختہ میرے قلم کو تیز کر دیا۔ مسلمانوں کی "قرآنی وحدت" جس نظام کے تحت ساڑھے بارہ سو سال سے مسلسل محفوظ چلی آ رہی تھی، اور وہ تھوڑا بہت اختلاف حنفیت اور شافعیت کا جو تھا وہ اتنا مضمحل کمزور، بے جان تھا کہ اس کا ہونا جیسا کہ میں نے عرض کیا نہ ہونے کے برابر تھا، وہ ساتھ ہی یہ کہ دیکھیے جن حقائق اور مسائل کا ذخیرہ "توخبر العامة عن العامة" کی راہ سے متواتر ہو چکا ہے اور اس میں ہم سب متفق ہیں۔

اختلاف جو کچھ بھی رہ گیا ہے وہ ایسے امور میں جن کی حیثیت اصول کی نہیں ہے بلکہ علامہ ابوبکر جصاص کے حوالہ سے جیسا کہ گزر چکا عموماً ان کا تعلق "تخییرات" اور نیز "افضل" پہلوؤں سے ہے۔ اسی بنیاد پر ہر ملک کے مسلمان عقیدۃً اور عملاً یک رنگی کی زندگی گزار رہے تھے کہ ہماری حکومتوں کے عام زوال کے بعد لفظ "تقلید" کی ملعونیت کا جھنڈا بلند کیا گیا۔ اور ان ہی "تخییرات" کے افضل پہلوؤں کے متعین کرنے میں تنازع ڈال دیا گیا کہ قرآن کے ان منصوص اور محکم مطالبات کی بھی پروا نہ کی گئی جنہیں صریح اور صاف صاف کھلے لفظوں میں مسلمانوں کو تفرق اور تنازع، اختلاف و شقاق سے منع کیا گیا تھا جس عمل سے قرآن کے بینات کی تعمیل صدیوں سے ہو رہی تھی اسی کو لعنت و نفرت کا ہدف بنایا گیا اور جن مسائل کا ہر پہلو جائز تھا انہی کے کسی ایک پہلو کی ترجیح دینے کا نام ترک دین رکھ دیا گیا دین میں امر و حکم کا اقتدار ہر مسلمان کو یا کم از کم ہر اس شخص کو دے دیا گیا جو اردو ترجموں سے ٹٹول ٹٹول کر قرآنی آیات و احادیث کا ترجمہ نکال سکتا ہو۔ مسلمانوں کی دینی قیادت و امامت کے مسئلہ کو ہر ملک بلکہ ہر شہر کے لاکھوں مرکزوں پر تقسیم کر دیا گیا

جو ایک تھے اور خدا کے فضل سے اب تک ایک ہی ہیں طے کر لیا گیا ہے کہ انکو لاکھوں اور کروڑوں حصوں پر بانٹ کر دم لیا جائے شاخوں کی حفاظت کرنے والے جڑوں کو کھود رہے ہیں اور کوئی نہیں جو ان کو روک سکتا ہو۔

لمثل هذا یذوب القلب من کمد　　ان کان فی القلب اسلام وایمان

سوچنے والے اتنا نہیں سوچتے کہ جس اسلام کو ان کر بارہ[۱۲۰۰] سو سال تک دنیا جہان کے سامنے مسلمان جب اسی تقلید کی گمراہیوں میں بھٹکتے آ رہے ہیں تو پھر انکو اسلام سے فائدہ کیا پہونچا۔ جو مذہب اپنوں کو بھی گمراہی سے نہ بچا سکا وہ دوسروں کیلئے کیا مفید ہو سکتا ہے؟ اور اس مذہب کے داعی کو کیا کامیاب داعی کہا جا سکتا ہے جسکی امت کی کثرت ہزار بارہ سو سال تک راہ حق سے دور رہی؟ اس وقت تک وہ رہی جبتک دنیا کے اکثر حصوں پر اسی کا اقتدار قایم تھا لیکن جب اپنے اقتدار کو کھو کر غلامی کا طوق ان کی گردنوں میں پڑا، تب سیدھی راہ انکے سامنے آئی اُف لکم ولما تعبدون۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب تو ایک بڑی چیز ہے کہ وہ میں دینی بصیرت جو علم و تقویٰ پر مبنی ہو پیدا ہونا آسان نہیں ہم تو دیکھتے ہیں کہ قانون جیسی چیز جسکی بنیاد صرف رسم و رواج اور عقلی تخمینوں پر قایم ہے، سوچنے والوں نے تو اس کے متعلق بھی یہی رائے قائم کی ہے سر جان سالمنڈ نے لارڈ ایلڈن کا ایک عجیب قول نقل کیا ہے۔

"قانون کا متیقن ہونا (یعنی طے شدہ ہونا) اس امر سے کہیں بہتر ہے کہ ہر ایک جج اپنے اپنے دور میں اسکی اصلاح کرنے اور اسکو ترقی دینے کے متعلق تنسیخ و ابطال کے ذریعہ منصوبے باندھا کرے" (اصول قانون صفحہ ۲۷۰)

اسی مصنف نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ

"انگلستان میں ججوں کی زیادہ قوت تھی اور عالم اور فاضل اور قانون پیشہ اشخاص ججی کے عہدہ پر مقرر کیے جاتے تھے اس لیے وہاں کے نظائر قانون کا دوسرے ملکوں سے زیادہ اثر و اقتدار رہا۔"

اور اسی وجہ سے کہ چونکہ عالم، فاضل، قانون پیشہ صاحب کے فیصلے نظائر ہوئے تھے اسلیے برٹش قانون میں بیان کیا گیا کہ

جب کسی امر کے متعلق طے شدہ قانون موجود ہو تو اس مسئلہ پر قانون موجودہ کا اطلاق کرنا عدالتوں کا فرض ہے اور ایسی صورت میں کسی عدالت اپنی رائے کو دخل دینے کی مجاز نہیں ہے اور نہ اپنے بنائے ہوئے قانون سے اسکا تصفیہ کر سکتی ہے" (اصول قانون صفحہ ۲۷۹)

مسلمانوں کے فہم عامہ کا تصفیہ بھی اسکے سوا اور کیا تھا کہ آئمہ مجتہدین چونکہ ارباب علم و فضل تھے انہوں نے غور و فکر اجتہاد و استنباط کے بعد جو مسائل ایک دفعہ طے کر دیے ہیں ان پر عمل پیرا رہنا چاہیے۔ اور خواہ مخواہ آئے دن اس میں تنسیخ کے منصوبے باندھنے کی ضرورت نہیں۔

سر جان سالمنڈ نے اس اصرار کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"عدالتی فیصلوں کو صحیح سمجھنے کے دو وجوہ ہیں ایک یہ کہ ظن غالب کی بنا پر عدالتوں کی تجویز صحیح خیال کی جاتی ہے

دو دوسرے یہ کہ اگر فیصلہ عدالت غلط بھی ہو تو ضرورتاً اسکو صحیح خیال کرنے کی ضرورت ہے:

غالباً اسی ضرورت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"جب کسی مسئلہ کا بعد غور و فکر عدالت کی جانب سے تصفیہ ہو جاتا ہے تو اسی مسئلہ کے دوبارہ پیش ہونے پر عدالت سے وہی جواب ملتا ہے اور عدالت پر اسی طرح کا جواب دینا لازم ہے یہی نہیں کہ جس تصفیہ کے بعد جس قسم کے مقدمات پیش ہوں اور انہیں اس قسم کے مسائل کو فیصل کرنے کی ضرورت ہو تو عدالت کو ان تمام مسائل سے متعلق وہی جواب دینا چاہیے جو اس نے سابق میں دیا تھا"

ہمارے فقہا نے تلفیق کے عدم جواز کے وجوہ لکھتے ہوئے جن مصالح پر اس کو مبنی قرار دیا ہے۔ کیا اسی کی یہ تکرار یا آواز بازگشت نہیں ہے؟ آخر میں سالمنڈ ہی لکھتے ہیں:۔

"بہر حال اس قاعدہ کی وجہ سے فیصلہ جات عدالت میں ہم آہنگی و مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو صحیح معنوں میں عدل و انصاف کرنا ممکن نہیں ہے"

اسی بیان کا آخری فقرہ یعنی

"بذا نظائر کی وجہ سے ججوں کو اپنی ذاتی رائے پر فیصلہ کرنے کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے اور جوں جوں نظائر کی کثرت ہوتی جائیگی آئندہ زمانہ میں شاید ہی عدالتیں اپنی رائے سے مقدمات کا تصفیہ کر سکیں گی" (ص۲۰۲)

ان لوگوں کیلئے قابل غور ہے جو اس الجھن میں پڑے ہوئے ہیں کہ بتدریج اجتہاد کا دروازہ مسلمانوں میں کیوں بند ہوتا چلا گیا حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز کی صحیح کیفیت کا اندازہ عمل ہی سے چلتا ہے آج نہ مسلمانوں کے پاس اپنی عدالتیں ہیں نہ اپنا قانون۔ قانون کی عملی دنیا سے الگ ہو کر اس وقت مسلمان نظریہ سازی کے عارضہ میں مبتلا ہیں اور انہی مسلمانوں پر منہ آ رہے ہیں جن کو عملی کاروبار نے اس نتیجہ تک پہونچا دیا تھا جس پر قدرتی طور پر ہر قانونی کاروبار کرنے والی قوم پہنچ سکتی ہے میں نے دراصل اسی لیے سرجان سالمنڈ کی کتاب سے یہ چند اقتباسات نقل کر کے پیش کر دیئے ہیں تاکہ عملی اقوام جن نتیجوں تک پہنچی ہیں اسکا کچھ اندازہ نظریہ بازی کی ان گرہ والوں کو ہو سکے جو غلامی کی دنوں میں عمل کی دنیا سے منقطع ہو کر مختلف قسم کی غیر عملی تجویزیں مسلمانوں میں پیش کر کے "تحقیق" لے رہے ہیں۔ ایک اور موقع پر اسی کتاب میں اسی مصنف نے لکھا ہے:۔

"اصل حق و انصاف پر عمل کرنا عدالتوں کا فریضہ ہے لیکن اس اصول کی تلاش کرنے کی عوض یا بصورت عدم موجودگی اپنے یا اپنے ضمیر کی ہدایت کے اصول بنا کر خطرے میں پڑنے سے انکے لیے مناسب ہے کہ انہی اصول کو اختیار کریں جنکو قوم کی پسندیدگی اور قدامت کا تحفظ حاصل ہو" (ص۲۲۳)

یہ روشن خیال یورپ کے خیالات قانون "جیسی ماغی اور محض عقلی چیز کے متعلق ہیں جب عقلی خطرہ سے بچنے کی راہ یہی تقلید ہی تو دینی خطروں سے بچنے کے لیے اگر علماء نے جس پر اتفاق کر لیا ہے اور سلف صالح سے جو باتیں چلی آ رہی ہیں انہی پر چلنا جو لوگ قرین احتیاط سمجھتے ہیں آج انہی پر تاریک خیالی کا الزام لگایا جا رہا ہے؟ خصوصاً ایسی چیزوں سے متعلق جن کا زیادہ تر تعلق "تجربات" اور "انفعالات" سے ہے۔

(باقی)

یہاں تک کے مذکورہ بیان اور اہل تجربہ کی ان شہادتوں سے ناظرین کرام بھی اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہوں گے کہ علم و اجتہاد کے لحاظ سے قابل اعتماد ہستیوں کی تقلید خطرات سے بچنے کی ایک مسلمہ فطری ... ہے یہی وجہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے ارتقاء علمی کے بہترین زمانوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ بصیرت رکھنے والے ائمہ دین نے ہمیشہ سے اس کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔

ائمہ اسلام میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو یہ قاعدہ مشہور کیا گیا ہے کہ

عمل اهل المدينة حجة	اہل مدینہ کا عمل حجت (دلیل) ہے۔

یا حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب نے جو لکھا ہے کہ:-

كان ابو حنيفة الزمهم بمذهب ابراهيم واقرانه لا يجاوزه الا ما شاء الله۔	ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ زیادہ تر ابراہیم النخعی اور ان کے ہمعصروں کے مذہب کو اختیار کرتے تھے اور اس سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے الا ماشاء اللہ یعنی صرف چند چیزوں میں۔

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:-

فلخّص قول ابراهيم من كتاب الآثار لمحمد و جامع عبد الرزاق ومصنف ابن ابی شيبة ثم قائسه بمذهبه تجده لا يفارق تلك المحجة الا في مواضع يسيرة وهو في تلك اليسيرة ايضا لا يخرج عما ذهب اليه فقهاء كوفة (انصاف ص)	امام محمد کی کتاب الآثار اور جامع عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں سے ابراہیم النخعی کے اقوال علیحدہ چھانٹ لیے جائیں پھر ابوحنیفہ کے اقوال سے ان کو ملایا جائے تو نظر آئے گا کہ ابراہیم کی راہ سے وہ بہت کم علیحدہ ہوتے ہیں یہ بہت قلیل اور نادر مقامات بھی ایسے ہیں جو فقہائے کوفہ کے اختیار کردہ ہیں یعنی کوفہ کے فقہا کے دائرہ سے امام ابوحنیفہ تجاوز نہیں کرتے ہیں)

تو ان کا مطلب بجز تقلید کے اور کیا ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ مشہور مسئلہ یعنی حدیث مرسل کے متعلق جو یہ لکھتے ہیں کہ

قبله ابو حنيفة ومالك واحمد بن حنبل في اشهر الروايتين۔	ابوحنیفہ اور مالک نے اور احمد بن حنبل کی مشہور روایت کے بموجب ان نے بھی حدیث مرسل کو قبول کیا ہے۔

بلکہ امام شافعی تک سے متعلق الآمدی نے نقل کیا ہے کہ ایسے "مرسلات"

ان يكون المرسل قد عرف من حاله انه لا يرسل	جن کے ارسال کرنے والے کے متعلق یہ معلوم ہو گیا ہو۔ وہ اصل

عمن فیہ علۃ من جہالۃ او غیرہا کمراسیل ابن المسیب فہو مقبول (احکام الاحکام ج ۲ ص ۱۰۱)	ایسے لوگوں سے نہیں کرتا یعنی سلسلہ روایت میں نام ایسے آدمیوں کا ترک نہیں کرتا جن میں جہالت وغیرہ کی علت ہو جیسے ابن المسیب کے مراسیل کا حال ہے تو اس قسم کے لوگوں کی مرسل روایتیں بھی قبول کی جائیں گی

تو ان سب کا مطلب بھی یہی ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف معتبر لوگوں نے جو بات منسوب کی ہو خواہ اس کی سند نہ بھی بیان کریں لیکن ان کا منسوب کرنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے بے سوچے سمجھے اس کو منسوب نہ کیا ہوگا۔ بلکہ غالب امید ایک متدین متقی پرہیزگار آدمی سے یہی کی جا سکتی ہے کہ اپنے آپ کو مطمئن کر لینے کے بعد ہی اس بڑی ذمہ داری کو انھوں نے قبول کیا ہے۔ یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اس بات کو منسوب کیا ہے، کیونکہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، قطع نظر حدیث "من کذب علی متعمداً" (الحدیث) کے اگر غور کیا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی امر کا انتساب درحقیقت خدا کی طرف اس بات کا انتساب ہے۔ جس کے دین و ایمان، سیرت و کردار پر بھروسہ کیا جاتا ہو کیا اس سے اس کی توقع ہو سکتی ہے کہ قصداً وہ خدا کی طرف اور خدا کے دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کرے جسے وہ جانتا ہے کہ پیغمبر کی طرف اس کا انتساب صحیح نہیں ہے؟ یقیناً ایک حیثیت سے یہ افتراء علی اللہ ہے، اور قرآن میں افتراء علی اللہ کو ایک سے زائد مقامات پر سب سے بڑا ظلم قرار دیا گیا ہے، جن بزرگوں کی عدالت مسلم ہو یقیناً ان سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی، یہ کھلا ہوا ایک عقلی قانون ہے اور اسی بنا پر مرسل کو عموماً حجت قرار دیا جاتا ہے۔

الآمدی جو شافعی المسلک عالم ہیں لکھتے ہیں کہ

والمختار قبول مراسیل العدل مطلقاً (احکام الاحکام ص ۱۱)	جو بات بالآخر تسلیم کر لی گئی ہے وہ یہی ہے کہ عادل راوی کی مرسل مقبول ہیں

بتلایا جائے کہ دوسرے الفاظ میں یہ تقلید نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یعنی مرسل کے اس قول پر بھروسہ کیا جاتا ہے جسے بغیر سند کے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے۔ مان لیا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی بات ہے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ آج بھی بخاری و مسلم وغیرہ کی متصل حدیثوں کو ہم جو صحیح مانتے ہیں تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جن راویوں پر ان ائمہ حدیث نے اعتماد کیا ہے اس اعتماد میں ہم ان کی تقلید کرتے ہیں جیسے ہر فن کے ماہرین پر طبعاً ہر شخص بھروسہ کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت غالبہ کی مذہبی زندگی اسی تقلید کے محور پر گردش کرتی رہی ہے اور کر رہی ہے اور اسی تقلید میں ان کی اس وحدت دینی کی ضمانت مستور ہے جس کے مطالبہ سے قرآن معمور ہے۔

پہلی صدی ہجری اور دوسری صدی ہجری کی دو ثلث مدت تک عام مسلمان خصوصاً جن کا تعلق اہل السنت و الجماعت سے تھا اعتقاداً و عملاً اسی روش کے پابند تھے، یعنی اپنے اپنے علاقے کے اہل علم و فتویٰ کی تقلید کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مختلف حالات سے گزرتے ہوئے، مدینۂ منورہ اور حجاز کے مسلمانوں میں، جو علمائے مدینہ سے وابستہ تھے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو امتیاز حاصل ہوا اور آپ ہی کے تلامذہ نے مصر اور افریقہ پہونچکر مالکی طریقۂ عمل کو مروج کیا۔ رفتہ رفتہ اس کا اثر یورپ کے اس علاقہ تک پہونچ گیا جس پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ میری مراد اس سے اندلس سے ہے۔ اسی طرح کوفہ جو مشرق کے مسلمانوں کا مرکز تھا اس میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا علمی اقتدار غالب ہوگیا۔ آپ کے تلامذہ چونکہ مشرقی ممالک عراق۔ عرب۔ ایران۔ خراسان۔ بخارا۔ کابل تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس لئے ان ممالک میں حنفی مکتب خیال "مسلمانوں کا عام شرعی دستور بن گیا۔

تقلید کے مضر اثرات | لیکن جس طرح دنیا کے "ہر خیر" میں "شر" کا کوئی نہ کوئی پہلو پیدا ہو ہی جاتا ہے مسلمانوں کا اپنے دیندار اسلاف پر اعتماد جس کا دوسرا نام تقلید ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے۔ وہی ہماری وحدت ملی کی ضامن ہے اور اس لیے بھی یقیناً بہت بڑا خیر ہے جس سے مسلمان بحمداللہ تیرہ سو سال سے متمتع ہو رہے ہیں، مگر اسلاف پر اس اعتماد ہی کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ بہ تدریج دین کے اساسی و حقیقی سرچشموں سے پچھلی نسلوں میں بیگانگی بڑھتی چلی جاتی ہے اور ساری توجہ، ساری محنت ہر چیز سے ہٹ کر محض اسلاف کے اقوال و نظریات میں غرق ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ یہی چیز بڑھتے ہوئے اس نقطہ پر بھی پہونچ جاتی ہے، کہ پچھلی نسلیں اپنی اگلی نسلوں کے اعلیٰ طبقات کو چھوڑتے ہوئے آخر میں ان ہی بزرگوں پر بھروسہ کر لیتی ہیں، جو زماناً ان سے قریب تر ہوتے ہیں۔ اندلس کے مالکی مسلمانوں کا جو حال آخر میں ہوگیا تھا۔ اس کی تصویر چھٹی صدی کے مشہور مالکی امام علامہ ابوبکر بن العربی نے ان الفاظ میں کھینچی ہے، اپنے عربی مقالہ میں مولانا الاستاذ مناظر احسن الگیلانی نے ان کی کتاب "العواصم والقواصم" سے نقل کیا ہے کہ

قال آلت الحال الی لا ینظر	یہ تو لوگوں کا حال اس حد تک ہوگیا کہ امام مالک اور ان کے
الی قول مالک و کبراء اصحابه ویقال قد	بڑے تلامذہ کے اقوال ہی نظر انداز ہوگئے، اور کہا جانے لگا
قال فی هذا المسئلة اهل قرطبة واهل	کہ اس مسئلہ میں قرطبہ والوں کا یہ قول ہے اور طلمنکہ کے باشندوں
طلمنکه واهل طلیبارة واهل طلیطلة	کا یہ خیال ہے اہل طلیبرہ اور شہر طلیطلہ والوں نے یہ کہا ہے

فانتقلوا من المدینۃ وفقہائہا الیٰ طلیطلۃ وطریقہا

اور یوں مدینہ منورہ اور مدینہ کے فقہا سے منتقل ہو کر لوگ طلیطلہ کے علماء کے پیچھے چل پڑے۔

اور یہ حال کچھ اندلس کے مالکیوں ہی کا نہیں ہو گیا تھا بلکہ حنفی ممالک اور ان کے مختلف حصوں کی مذہبی تاریخ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ہر جگہ ان کی بھی یہی حالت ہو گئی تھی، آج بھی ہندوستان ہی کو دیکھ لیجیے عوام بیچاروں کا کیا ذکر، کیا یہاں کے ارباب فتویٰ کے سامنے بھی بجائے امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف امام محمد کے اپنے متاخرین ہی کے اقوال نہیں رہ گئے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اسلاف پر اعتماد کے جذبہ کو اس افراط کی حد تک ترقی دینے کا یہی نتیجہ ہے جو بالآخر قوموں اور امتوں کے سامنے اس شکل میں نمودار ہوتا ہے ـــــ اور یہ قصہ تو صدیوں بعد کا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ابو الفضل زجاج کے حوالے سے الخطیب نے واقعہ نقل کیا ہے کہ

لما قدم الشافعی بغداد وکان فی الجامع امّا نیف وادجون حلقۃ او خمسون حلقۃ (تاریخ خطیب بغداد ج ۲ ص۶۸)

جب امام شافعی بغداد تشریف لائے تو ان دنوں بغداد کی جامع میں تقریباً چالیس پچاس حلقے درس کے قائم تھے۔

لیکن بغداد کے ان تمام حلقوں میں کیا ہو رہا تھا۔

هم یقولون قال اصحابنا،،

یعنی ہر حلقہ سے یہی آواز آتی تھی کہ "ہمارے استادوں نے یہ کہا ہے"

ظاہر ہے کہ بغداد کے ان حلقوں کا زیادہ تر تعلق علماء عراق ہی سے ہو سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ کے شاگردوں ہی کے عموماً یہ حلقے ہوں گے، گویا وہی کیفیت جس کا احساس چھ سو سال بعد ابو بکر بن العربی کو اندلس میں ہوا تھا کہ "قال اللہ" اور "قال الرسول" کی جگہ طلیطلہ اور طلیبرہ کے علماء اور فقہا کے "اقوال" ہی نے لے لی تھی، بغداد کی جامع مسجد میں یہ منظر دوسری صدی کے اواخر ہی میں پیش ہو گیا تھا یہ حال تسلیم ہے کہ تقلید ہی کی افراط کا یہ خطرناک نتیجہ تھا، اور تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے گزشتہ مذاہب و ادیان کے ماننے والے بھی زیادہ تر اسی عام عارضہ کے شکار ہوئے اور بتدریج اسی بیماری نے ان کو اپنی اصلی کتاب سے منقطع کر دیا۔

پس واقعہ تو یہی ہے کہ ان دو مرکزی شہروں یعنی مدینہ منورہ اور کوفہ کے دونوں اماموں (امام مالک و امام ابو حنیفہ) رحمۃ اللہ علیہما نے دوسری صدی ہجری کے نصف اول ہی میں اسلامی قانون کو اپنے اپنے

خاص طریقۂ فکر واجتہاد سے مدوّن کرکے جیسا کہ میں نے عرض کیا دُنیائے اسلام کے خاص خاص حصوں میں کچھ اس طرح پھیلا دیا تھا اور ان دونوں اماموں کے مرتبہ اسلامی قانون کو کچھ ایسے قدرتی مساعد اسباب بھی مل گئے تھے کہ جن جن علاقوں میں ان دونوں حضرات کے یہ کارنامے پہونچے وہاں کے مسلمان باشندوں نے ان کو مان لیا اور اپنی عام دینی زندگی کا انہی کو دستور العمل بنا لیا، حکومت کے عدالتی و احتسابی محکموں میں بھی ان ہی دونوں میں سے کسی ایک فقہ کا رواج ہو چکا تھا جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اور یوں بھی لوگ اس سے ایک حد تک واقف ہیں، کون نہیں جانتا کہ

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے بغداد کی حکومت عباسیہ نے حنفی فقہ کو اور یحییٰ بن یحییٰ مصمودی تلمیذ امام مالک کے زیر اثر اندلس کی اُموی حکومت نے مالکی فقہ کو اپنی اپنی عدالتوں کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا تھا۔

اور گو ان دونوں فقہوں میں مختلف مسائل کے لحاظ سے کچھ اختلاف ضرور تھا لیکن ان اختلافات کی حیثیت یہی تھی کہ مالکی فقہ کے بانی مبانی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ

لما حج ا... قال لمالک عزمت ان آمر بکتابک هذه التی وضعتها فتنسخ وابعث فی کل مصر من امصار المسلمین منها نسخة وآمرهم بان یعملوا بما فیها ولا یتعدوه الی غیره۔

جب منصور خلیفہ عباسی نے حج کیا تو امام مالک سے اس نے کہا کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ تم نے جو کتاب لکھی ہے (یعنی موطا)، اس کو نقل کراؤں اور مسلمانوں کے ہر ہر شہر میں ایک ایک نسخہ اس کا بھیجکر فرمان کر دوں کہ لوگ اسی کتاب کے موافق عمل کریں اور اس سے تجاوز نہ کریں ؎

؎ منصور نے ایسا ارادہ کیوں کیا تھا۔ مورخین نے وجہ تو نہیں لکھی ہے لیکن جو منصور اور امام ابو حنیفہ کے تعلقات سے ... ہیں ان کے لیے اس کا سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ منصور چاہتا تھا کہ جب اس نے مشرق کے مرکز بغداد کو دار السلطنت بنایا ہے تو مشرق کے امام یعنی ابو حنیفہ کو اپنا ہم نوا بنا لے لیکن امام نے اس کی ہمنوائی سے انکار کیا تا اینکہ اسی کشمکش میں امام کو شہید ہونا پڑا۔ لکھا ہے کہ منصور کے ہاتھوں جب امام ابو حنیفہ شہید ہوئے تو اس کا چچا عیسےٰ منصور کے پاس آیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں اس نے کہا منصور تو نے یہ کیا کیا، مشرق کے امام کو تو نے قتل کر دیا، بلاوجہ لاکھوں تلواریں اپنے آپ پر تو نے خود کھچوا لیں۔ دراصل منصور امام ابو حنیفہ کے مقابلہ میں امام مالک کے مذہب کی سرپرستی کرکے امام ابو حنیفہ کے اثر کو کم کرنا چاہتا تھا۔ ۱۲

یہ منصور کی ایک سیاسی چال تھی، امام مالک کی دینی بصیرت سے وہ کیا پوشیدہ رہ سکتی تھی آپ نے جواب میں فرمایا:۔

یا امیرالمومنین لاتفعل هذا فان الناس قد سبقت الیهم اقاویل وسمعوا احادیث ورووا روایات واخذ کل قوم بما سبق الیهم فدع الناس وما اختار اهل کل بلد منهم لانفسهم (انصاف ص۲۲)	امیرالمومنین ہرگز ایسا نہ کیجیے کیونکہ لوگوں کے پاس اقوال پہونچ چکے ہیں، وہ حدیثیں سن چکے ہیں، روایتیں روایت کر چکے ہیں اور جو چیزیں ان تک پہلے پہونچی ہیں ان پر عمل کر چکے ہیں بس ہر شہر کے باشندوں کو اسی طریقۂ عمل پر جسے خود نے اختیار کر لیا چھوڑ دیجیے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اسلام کے فروعی اختلافات یعنی فقہی جزئیات میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں اگر ان کی اہمیت اسی قدر ہوتی جتنی اس زمانہ میں ان کو دی جا رہی ہے، تو منصور کے اس مصمم ارادے کے بعد حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے "دع الناس وما اختار اہل کل بلد منہم لانفسہم" (یعنی لوگوں کو اسی فقہی مسلک پر چھوڑ دیجیے جو اس شہر کے باشندوں نے اپنے لیے اختیار کر لیا ہے) اس کا مشورہ کیا جائز ہو سکتا تھا، پس بات وہی معلوم ہوتی ہے کہ جس علاقہ میں جس مجتہد اور امام کا مذہب مروج ہو چکا ہے، اس کو اسی حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ بہرحال منصور نے امام کے مشورہ کو مان لیا اور جن جن علاقوں میں ان دونوں اماموں کی فقہ پہونچ کر معمول بہ بن چکی تھی وہاں کے لوگوں کو اسی حال پر چھوڑ دیا گیا۔ گویا دوسری صدی ہجری کے نصف اول ہی میں ایک ایسی حالت پیدا ہو گئی تھی کہ بظاہر یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ آئندہ فقہ کے ان دو مکاتب خیال کے سوا اہل السنت والجماعت میں اب کسی دوسری فقہ کے فروغ پانے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اس خوش گوار کیفیت کے پیچھے پیچھے وہ خطرہ بھی چھپا ہوا تھا جو بے پاؤں مسلمانوں کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا جب دوسری صدی کے اختتام سے پہلے ہی بغداد کے پچاس چالیس پچاس حلقہائے درس میں بجائے "قال الرسول" اور "قال اللہ" کے "قال اصحابنا" کا قبضہ ہو چکا تھا تو اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ اگر مسلمانوں کو اس حال پر چھوڑ دیا جاتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام کے اساسی ماخذوں اور حقیقی سرچشموں سے دور ہونے میں وہ کہاں تک پہونچ چکے ہوتے [۱]

[۱] یہود اور نصاریٰ کے صحائف تورات و انجیل سے مزدور ہوتے ہوتے جو یہاں تک پہونچ گئے کہ حقیقی سریانی زبان والی انجیل کا دنیا میں کوئی نسخہ ہی باقی نہ رہا، اور تورات گو عبرانی زبان میں پائی جاتی ہے لیکن جس حال میں پائی جاتی ہے

اگرچہ مجھے یہ ماننا چاہیئے کہ بغداد کی جامع میں "قال صحابنا" کی یہ گونج بھی سلف صالح ہی کے ایک خاص طریقۂ عمل کے اتباع ہی سے پیدا ہوئی تھی خصوصاً عراق کے فقہا کے استاذ الاساتذہ ابراہیم نخعی کا تو معمول ہی یہ بیان کیا جاتا ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "انصاف" میں نقل کیا ہے کہ

قد روی حدیث نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المحاقلۃ والمزابنۃ فقیل لہ اما تحفظ عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حدیثاً غیر ھذا قال بلیٰ ولکن اقول قال عبد اللہ قال علقمۃ احب لی۔ (انصاف ص۲)

ابراہیم نخعی نے ایک دن یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلعم نے "محاقلہ" اور "مزابنہ" سے منع فرمایا ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس حدیث کے سوا تمہیں رسول اللہ صلعم کی کوئی اور حدیث یاد نہیں ہے؟ بولے کیوں نہیں مگر اس طرح کہنا کہ عبداللہ بن مسعود نے کہا ہے، علقمہ نے کہا ہے یہ مجھے زیادہ پسندیدہ ہے۔

اب یہ بات کہ بجائے "قال الرسول" کے اپنے استاذ علقمہ یا استاذ الاستاذ عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف منسوب کرکے "قال علقمۃ"، "قال عبداللہ" کہنا ان کو کیوں زیادہ پسند تھا؟ اس کا سراغ کوفہ ہی کے دوسرے امام جو نخعی کے ہمعصر بھی ہیں یعنی شعبی کے اس قول سے مل سکتا ہے جس کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہی نے نقل کیا ہے۔

قد سئل عن حدیث وقیل انہ یرفع الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال لا علے من دون النبی صلے اللہ علیہ وسلم احب الینا فان کان فیہ زیادۃ ونقصان کان علے من دون

ایک حدیث کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا اور کہا گیا کہ اس کو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بادراست منسوب کرکے بیان کرتے ہیں، امام شعبی نے فرمایا نہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نیچے کے آدمی کی طرف انتساب میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اس سے خود یہود بہ نسبت دوسری قوموں کے زیادہ واقف ہیں تو اس کا راز بھی یہی ہے کہ انھوں نے ان خدائی نوشتوں سے اپنا تعلق منقطع کرکے اپنے احبار و رہبان ہی کی باتوں اور انہی کے فیصلوں کو اپنا دین و ایمان بنا لیا تھا۔ ہمارے ملک ہندوستان میں کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے پاس "وید" نامی کوئی کتاب تھی جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ اسی سے ان کا دھرم نکلا ہے لیکن جب ہندوؤں میں بجائے "وید" کے اپنشدوں شاستروں پورانوں کا بتدریج زور بندھا تو وید انکے ہاتھ سے گم ہوگیا اور اب تو یہ حال ہے کہ دو نیم تاریخی افسانے "رامائن" اور "مہابھارت" پر ان کے دین کا سارا دارومدار رہ گیا ہے قوموں کے دین کی یہ داستان بڑی ہی دردناک ہے کہ خدا کے علم سے دین کی ابتدا ہوتی ہے اور خاتمہ چند خود تراشیدہ دلچسپ افسانوں اور داستانوں پر ہو جاتا ہے ۱۲

النبی صلی اللہ علیہ وسلم (انصاف منہ؟) | کیونکہ اگر بیان میں کمی بیشی ہوگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم پر تو نہ ہوگی بلکہ جو آپ کے پیچھے ہے اُسی کی طرف یہ انتساب ہوگا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی غرض اس طرزِ عمل سے یہ تھی کہ پیغمبر کی طرف کوئی غلط بات منسوب کرنے کی ذمہ داری ان پر نہ عائد ہو جائے، اور ان ہی کا کیا خود امام الکوفہ معلم الامۃ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کے متعلق عام کتابوں میں ایسی روایتیں مختلف الفاظ میں پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف براہ راست کسی امر کے منسوب کرنے میں وہ کتنے محتاط تھے، کبھی ایسا اچانک کرتے بھی تو اس کی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے لکھا ہے کہ کانپنے لگتے، آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور آخر میں حدیث ختم کر کے یہ اضافہ کرتے کہ "اسی کے قریب قریب" "اسی طرح کچھ" "اسی کے مانند" آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

مگر ظاہر ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے یہ بالکل دوسری بات ہے، اور اب جو جامع بغداد میں "قال اللہ و قال الرسول" سے ہٹتے ہوئے سارا زور "قال اصحابنا" پر دیا جا رہا تھا تو یہ دوسری چیز ہو گئی تھی یعنی یہ حرکت دراصل اس انجام کی طرف تھی جس سے دُنیا کے دوسرے مذاہب والوں کو دوچار ہونا پڑا اور اسی کی بدولت اپنا سارا اصلی سرمایہ کھو کر ان بیچاروں کو اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لیئے چند سُنے سُنائے قصوں اور کہانیوں پر بھروسہ کرنے پر آج مجبور ہونا پڑا ہے۔ تقریبًا تمام مذاہب و ادیان جو کسی نہ کسی شکل میں کرۂ زمین پر پائے جاتے ہیں سب ہی کا یہی حال ہے، لیکن نہ قرآن ایسی کتاب تھی جس کے ضایع ہو جانے کے بعد دوسری کتاب آسمان سے اُترنے والی تھی اور نہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اُن رسولوں میں تھے جن کی صحیح تعلیم کے مندرس ہونے اور مٹ جانے کے بعد عمومًا قدرت دوسرے رسولوں کو مبعوث کرتی رہی اور اسی ذریعہ سے پھر مٹتے ہوئے ادیان تر و تازہ ہوتے رہتے تھے۔

تقلید کے اس خطرناک پہلو کا ردعمل | اب خواہ کسی نے کہا ہو یا نہ کہا ہو لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اس خطرہ کے ردِ عمل اور سدِ باب کے لیئے دوسری صدی ہجری کے اختتام پر حق تعالےٰ نے اسلام کو وہ ہستی عطا کی جن کا نام محمد بن ادریس الشافعی الامام رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی

لہ دراصل "میں" سے مراد حضرت الاستاذ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں کا تبوں کی بجنسہ الفاظ کو یہیں یہاں داخل کر دیا ہے ۱۲ عبدالرحمٰن

ولادت ۱۵۰ ہجری میں ٹھیک اسی سال ہوئی جس سال امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، قدرت نے امام شافعی کے ساتھ بڑی فیاضیوں سے کام لیا تھا خلقاً و خُلقاً ذہناً و دماغاً قطعاً ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے ان فطری خوبیوں کے ساتھ خدا نے ان کو ایسے مواقع عطا کیے کہ ایک طرف حجاز کے علمی مرکز تب خیال میں باضابطہ تعلیم پانے کا ان کو موقعہ ملا، مکہ معظمہ کے اساتذہ کے سوا مدینہ میں حضرت امام مالک کی طویل صحبت ان کو میسر آئی اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد جب بغداد پہونچے تو امام ابوحنیفہ کے مذہب کے راوی خاص امام محمد بن حسن الشیبانی سے فقہ ابی حنیفہ کا علم انھوں نے حاصل کیا۔

حافظ ابن حجر نے ان کی سوانح عمری میں ابوالولید بن ابی الجارود کے ایک طویل بیان کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

وانتھت ریاسۃ الفقہ بالمدینۃ الی مالک
بن انس رحل الیہ ولازمہ واخذ عنہ
وانتھت ریاسۃ الفقہ بالعراق الی ابی حنیفۃ
فاخذ عن صاحبہ محمد بن حسن حملاً لیس فیہ
شیٔ الا وقد سمعہ علیہ (توالی التاسیس ۲۲م)

مدینہ میں لکہ ابن انس راس الفقہا تھے امام شافعی کی خدمت
میں حاضر ہوئے ایک عرصے تک رہے اور ان کی پوری فقہ حاصل کی،
اسی طرح عراق میں امام ابوحنیفہ کی فقہ کو برتری حاصل تھی
اس کو آپ نے امام کے شاگرد خاص امام محمد سے حاصل کیا۔

اسی کا نتیجہ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا یہ ہوا کہ

فاجتمع لہ علم اھل الرأی وعلم اھل الحدیث (توالی التاسیس)

یعنی امام شافعی میں حنفی فقہ اور مالکی فقہ دونوں ایک جگہ جمع ہوگئے

اور صرف یہی نہیں بلکہ امام شافعی نے جس زمانہ میں ہوش سنبھالا، یہ اسلام کا وہ عہد ہے جب دینی علوم کے سوا عقلی اور ذہنی علوم و فنون کے تراجم بھی دوسری زبانوں سے عربی میں شروع ہو چکے تھے اور خود عربی زبان بھی ایک مستقل تصنیفی و تالیفی زبان کی شکل اختیار کر رہی تھی! امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ علاوہ دینی علوم قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ کے انھوں نے ان علوم کی بھی تکمیل کی تھی جنھیں مسلمان اس زمانہ میں "علوم الاوائل" کے نام سے موسوم کرتے تھے خصوصاً طب اور نجوم میں تو ان کے غیر معمولی کمالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے ابوحسن البصری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے۔

سمعت طبیباً بمصر یقول ورد الشافعی
بمصر فذاکرنی بالطب حتی ظننت انہ لا

میں نے مصر میں ایک طبیب کو کہتے ہوئے سنا کہ جب شافعی مصر آئے
تو انھوں نے مجھ سے طب کے متعلق مذاکرہ کیا تو میں نے گمان کیا کہ

يحسن غيره فقلت له ما قرأت عليه شيئاً من كتاب ابقراط فاشار الى الجامع وقال ان هؤلاء لا يتركونني (توالى التأسيس)

ان کو طب کے سوا کوئی دوسرا فن نہیں آتا، اس لیے میں نے ان سے کہا کہ میں آپ سے بقراط کی کتاب پڑھنا چاہتا ہوں امام شافعی نے جامع مسجد کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہاں کے (حلقہ درس کے لوگ) مجھے نہیں چھوڑتے (اس لیے طب کیلئے وقت نہیں ہے)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بقراط وغیرہ یونانی حکماء پر ان کی نہ صرف نظر پڑ چکی تھی بلکہ وہ ان کی کتابوں کو پڑھا بھی سکتے تھے۔ اسی کتاب میں امام شافعی کا وہ مشہور مقولہ بھی درج ہے ان کے بلا واسطہ شاگرد حرملہ کا بیان ہے کہ

يتلهف الشافعى على ما ضيع المسلمون من الطب ويقول ضيعوا ثلث العلم ووكلوه الى اليهود والنصارى

مسلمانوں نے طب سے جو بے اعتنائی برت کر اس کو کھو دیا امام شافعی اس پر اظہار افسوس فرماتے اور کہتے کہ مسلمان علم کے تہائی حصہ کو کھو بیٹھے[1] اور اس کو یہود و نصاریٰ کے سپرد کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی عظیم الشان غلطی تھی جو اس زمانہ کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتی ہے۔ ان کے متعلق

---

[1] حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول مسلمانوں کی موجودہ نسلوں کے لیے اپنے اندر عبرتوں کے خزانوں کو چھپائے ہوئے ہے جس زمانہ میں دنیا کی سیاسی امامت کے مالک مسلمان تھے اس وقت اگر طب جیسے علم سے بے تعلقی ہمارے لیے باعث نقصان بنی ہوئی تھی تو تعجب واسرے کے اس عہد میں علوم کونیہ خواہ آفاقی ہوں یا انفسی ان سے ہماری بے اعتنائی کن نتائج کو پیدا کر سکتی ہے؟ ہم اپنے مدارس میں دینیات کے پردہ میں فنی اور ادبی علوم کی جن بے شمار کتابوں کو پڑھا رہے ہیں کتاب و سنت خالص دینی علوم کی کتابیں ان کے مقابلہ میں صفر کی حیثیت رکھتی ہیں مگر یہ بجائے عقلی و ادبی علوم وہی ہیں جن کی پرستش سلمانوں پر ... ہوئی ذہن پر بھی اب ان کا کوئی قدر دان نہیں، نسلوں کی نسلیں مختلف جبل اور تعبیری مغالطوں سے انہی علوم کی تعلیم و تعلم میں اپنے اوقات عزیز کو ضائع کر رہی ہیں حالانکہ یہود و نصاریٰ نے ہمارے سیاسی اقتدار کے زمانہ میں یہ چالاکی کی کہ جن علوم و فنون کی اس زمانہ میں قدر تھی ان میں کمال پیدا کر کے وہ ہمارے سلاطین اور امراء کے درباروں میں گھسے، اور آج ہم جس حال میں ہیں سچ پوچھئے تو اس حال میں پہنچانے میں کافی حصہ ان لوگوں کا ہے جو اسلامی حکومتوں میں انہی کمالات کے بل بوتے پر دخیل ہوگئے تھے جبرئیل ابن بختیشوع جرجیس، اسحاق بن حنین، ثابت بن قرہ اور ان جیسے لوگوں نے عباسی حکومت میں داخل ہو کر کیا کیا ہے اور اپنی قوم کو کن کن راہوں سے نفع پہنچایا ہے یہ ایک راز ہے جس سے پردہ اٹھانے کی ضرورت ہے، الحمد للہ سلطان صلاح الدین رحمہ اللہ جس کے نام سے صدیوں یورپ کی اولاد نے اپنے بچوں کو خوف دلانے کا کام لیا ہے ودود صلاح الدین آرہا ہے،، آج بھی شاید ایک یورپین نژاد بچے کے سہم جانے کیلئے کافی ہو سکتی ہے، صلاح الدین الفاتح الحروب الصلیبی کے دربار میں میمون بن موسیٰ منطقی نے جو اقتدار حاصل کیا اور یہودیوں کے لیے جو منافع حاصل کیے یہودی صرف اسی اقتدار کو دنیا میں اپنے بقا کا سبب قرار دیتے ہیں، اور اس سے تو ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے کہ مغل حکومت کے تخت کو الٹ کر ان ہندوستان پر جو تخت بچھا گیا ہے جس قوم کے سر پر اس کا اصلی سہرا اس فرنگی ڈاکٹر کے سر ہے جس نے شاہجہاں کی شہزادی کا علاج کیا تھا، کیا مسلمان ابھی کسی تدبیر اپنے زوال کو اقبال سے بدلنے کی کوشش نہیں کر سکتے ہیں؟ لیکن کیا کیجئے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت علاقہ کے نام نہاد مقبول علوم کو ذریعہ نہیں بنائے فائدہ اٹھانے کے الٹا اپنی بنیاد ہلانے پر آمادہ ہو جاتی ہے کاش ایسے موقع پر مجھے میمون یاد آتا ہے جس نے اس زمانہ میں جب وہ صلاح الدین کا طبیب تھا یہودیوں کے سارے علوم کو زندہ کرنے کا کام کیا۔ قبل متن تذکرہ ۱۲ مناظر احسن گیلانی

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ طب یونانی کے سوا علم نجوم میں بھی امام شافعی کو ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی۔ حافظ ذہبی نے یہ روایت بھی درج کی ہے۔

کان الشافعی وھو حدث ینظر فی النجوم وما نظر فی شیئ الّا تفقہ فیہ و فھمہ۔

(توالی)

شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب نوجوان تھے تو علم نجوم کا مطالعہ کیا کرتے تھے اور وہ جس چیز میں بھی دخل دیتے اس میں مہارت حاصل کر لیتے اور اس کو خوب سمجھ لیتے۔

خالص قریشی النسل حجازی عرب ہونے کے سوا چونکہ شعر و ادب کا شوق بھی رکھتے تھے اس لئے کہتے ہیں کہ جوانی کے دنوں میں انہوں نے بھی اپنی زندگی کا ایک حصہ لغت عرب میں کمال پیدا کرنے کے لیے بادیہ عرب میں گزارا تھا جس کی تفصیل ان کی سوانح عمریوں میں مل سکتی ہے لیکن ان جہتی کمالات کے ساتھ اب یہ خدا کی طرف سے بات تھی کہ ان کا سارا رجحان مذہب اور مذہبی مسائل کی تحقیق و تنقیح میں لگ گیا تھا۔

امام شافعی کا خصوصی نصب العین

یوں تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے دین کے تمام شعبوں پر کام کیا ہے جو مختلف پروگرام تھا اس سے ان کی مختلف النوعیت خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے تلمیذ رشید ربیع سے حافظ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ

کان یجلس فی حلقتہ اذا صلی الصبح فیجیئہ اھل القرآن فیسئالونہ فاذا طلعت الشمس قاموا وجاء اھل الحدیث فیسئالونہ عن معانیہ وتفسیرہ فاذا ارتفعت الشمس فاستوت الحلقۃ للمناظرۃ والمذاکرۃ فاذا ارتفع النھار تفرقوا وجاء اھل العربیۃ والعروض والشعر والنحو حتی یقرب انتصاف النھار

(توالی ص۷۲)

فجر کی نماز کے بعد حضرت امام شافعی حلقۂ درس میں تشریف رکھتے تو پہلے اہل قرآن آتے اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتے پھر سورج طلوع ہونے کے بعد وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے اور حدیث کے طالب آتے اور آپ سے اس کے معانی و مطالب شرح دریافت کرتے۔ پھر اس وقت جب سورج کچھ زیادہ بلند ہوتا تو پورا حلقہ بحث و مباحثہ اور مذاکرہ میں مشغول ہو جاتا (غالباً فقہی مباحث پر) اس کے بعد جب دن زیادہ بلند ہو جاتا تو یہ سارے لوگ منتشر ہو جاتے اور ادب کے متعلم آتے اور عروض، شعر، نحو وغیرہ فنون کا درس شروع ہوتا، یہاں تک کہ دوپہر ہو جاتا۔

مگر ان کا انقلابی کارنامہ کیا تھا؟ اس سوال کا جواب آپ کو ان تاریخی وثائق سے مل سکتا ہے جن کا ایک حصہ میں یہاں نقل کرتا ہوں۔ ابوالفضل الزجاج کا جو قول الخطیب نے درج کیا ہے، جس کا ایک جز

کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ میں اب زجاج کے اس پورے قول کو نقل کرتا ہوں

لما قدم الشافعی بغداد وکان فی الجامع اما نیف واربعون حلقة او خمسون حلقة فلما دخل بغداد ما زال یقعد فی حلقة ویقول لهم قال الله وقال الرسول وهم یقولون قال اصحابنا حتی ما بقی فی المسجد حلقة غیره۔
(تاریخ الخطیب ج ۲ ص ۶۸)

جب امام شافعی بغداد آئے اس وقت بغداد کی جامع مسجد میں تقریباً چالیس یا پچاس حلقہائے درس موجود تھے آپ بغداد میں پہونچنے کے بعد ہر ایک حلقہ میں شریک ہوتے رہے اور "قال اللہ" "وقال الرسول" سنا سنا کر تے رہے اور ان حلقہائے درس میں بس "قال اصحابنا" کی گونج رہتی تا آنکہ جامع بغداد میں سوائے آپ کے حلقہ کے کوئی دوسرا حلقہ درس رہا ہی نہیں۔

امام ابو ثور جو امام شافعی کے مشہور بغدادی تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں اسی کے قریب قریب انکا بھی بیان ہے کہ

لما ورد الشافعی بالعراق جاءنی حسین بن علی الکرابیسی وکان یختلف معی الی اهل الرای فقال لی ورد رجل من اصحاب الحدیث قم بنا نسخر منه فذهبنا الیه فسأل الحسین عن مسئلة فلم یزل یقول قال الله وقال رسول الله حتی اظلم علینا البیت فترکنا ما کنا فیه و اتبعناه (توالی ص ۶۳)

جب امام شافعی عراق آئے حسین بن علی الکرابیسی میرے پاس آئے اور وہ اہل الرائے کے ہاں میرے ساتھ آیا جایا کرتے تھے، انھوں نے کہا سنتے ہیں یہاں ایک نیا صاحب حدیث آیا ہے چلو اس کے پاس چلیں ذرا اسکی خبر لیں اور مذاق اڑائیں تب ہم دونوں ان کے حلقہ میں حاضر ہوئے اور حسین بن علی نے ایک سوال کیا امام شافعی نے جوابی تقریر جواب میں شروع کی جس میں اب اللہ و رسول کے ارشادات ہی کا سلسلہ تھا یہاں تک کہ ہماری آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا بس جس راستہ پر ہم تھے اس کو چھوڑ کے ہم نے آپ ہی کی پیروی اختیار کرلی۔

ابو ثور کے رفیق درس حسین بن علی الکرابیسی کے حوالہ سے حافظ ابن حجر ہی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ

اخرج ابن ابی حاتم من طریق حسین بن علی الکرابیسی ما کنا ندری ما الکتاب والسنة والاجماع حتی سمعنا الشافعی یقول الکتاب والسنة والاجماع (ص ۵۶)

ابن ابی حاتم نے کہا کہ حسین بن علی الکرابیسی نے بیان کیا کہ ہم کتاب "سنت" "اجماع" کو نہیں جانتے تھے یہاں تک کہ ہم نے شافعی کو دیکھا کہ وہ کتاب، سنت۔ اجماع کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ الکرابیسی امام شافعی کے حلقہ میں داخل ہونے سے پہلے علماء اہل الرائے (جو اس زمانہ میں حنفی مکتب خیال کے علماء کا اصطلاحی نام تھا) کے ہاں مدتوں تعلیم پا چکے تھے۔ اب انہی کی یہ شہادت کہ شافعی سے پہلے ہم الکتاب، السنۃ، الاجماع کے الفاظ سے واقف نہ تھے، یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ اس زمانہ میں مسائل بیان کرنے میں لوگ صرف اپنے اساتذہ کا حوالہ دینا کافی سمجھتے تھے۔ یہ بات کہ یہ مسئلہ قرآن کی کسی آیت سے ثابت ہے یا کس حدیث سے مسئلہ کی یہ صورت قائم کی گئی ہے۔ اس پر بحث غیر ضروری خیال کرتے تھے۔ اور دوسری صدی ہجری میں امام شافعی پہلے آدمی ہیں جنہوں نے راہ بدلی یعنی بجائے اساتذہ کے انہوں نے چاہا کہ مسلمانوں کی دینی اور مذہبی زندگی کو پھر ان کے مذہب کے اصلی سرچشموں اور اساسی ماخذوں پر پیش کرنے کی عادت ڈالی جائے بلکہ امام بیہقی کی یہ روایت اگر صحیح ہے کہ

ان الشافعی انما وضع الکتب علی مالک انہ بلغہ ان بالاندلس قلنسوۃ لمالک یستسقیٰ بہا، وکان یقال لھم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقولون قال مالک فقال الشافعی ان مالکاً بشر یخطی، فدعاہ ذالک الی تصنیف الکتاب فی اختلافہ معہ وکان یقول استخرت اللہ فی ذالک سنۃ (توالی ص)

فقہ مالکی کے مقابلہ میں امام شافعی نے جو کتابیں لکھیں تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کو یہ روایت پہنچی کہ اندلس میں امام مالک کی ایک ٹوپی ہے جس کے وسیلہ سے (تبرکاً) اہل اندلس بارش کے لیے دعا کرتے ہیں اور لوگوں کا حال یہ ہو گیا تھا کہ ان سے جب کہا جاتا کہ اللہ نے کہا ہے، رسول نے کہا ہے تو جواب میں کہتے کہ امام مالک نے تو یہ کہا ہے، تب ہی پر امام شافعی نے فرمایا کہ مالک بہرحال آدمی تھے اور آدمی غلطی کرتا ہے کرتا ہے اور اسی بات نے ان کو اس پر آمادہ کیا کہ امام کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے اس پر کتاب تصنیف کریں۔ امام شافعی کہتے تھے کہ اس باب میں ایک سال تک حق تعالیٰ سے میں نے استخارہ کیا

تو امام شافعی کے علمی جد و جہد کا جو نصب العین میں نے متعین کیا ہے اس کا ثبوت خود ان ہی کے بیان میں مل جاتا ہے۔ لوگوں پر اپنے اپنے اساتذہ اور ائمہ کا اتنا گہرا اثر جڑ پکڑتا جاتا تھا کہ امام شافعی کو اندیشہ ہوا کہ مسلمان اللہ و رسول کو چھوڑ کر خدا جانے کہاں پہونچ جائیں گے۔ بتدریج مسلمان اس زمانہ میں کہاں تک پہنچ گئے تھے اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ جسے الحمیدی کے حوالے سے حافظ نے نقل کیا ہے، واقعہ یہ ہے۔

سأل رجل الشافعی مسئلۃ فافتاہ وقال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کذا فقال الرجل

ایک شخص نے شافعی سے ایک مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے اس کے متعلق فتویٰ دیا اور کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے اس شخص نے

القول بهذا۔ کہا کہ کیا آپ بھی اسی کے قائل ہیں؟

ظاہر ہے کہ اس مسئلہ پوچھنے والے کا یہ سوال کہ "کیا آپ بھی اسی کے قائل ہیں؟" کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر وہ مستحق ملامت ہی ہو سکتا تھا کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں ناسخ بھی ہیں منسوخ بھی ہیں۔ بہت سے عمومات اور مطلق الفاظ حدیثوں کے ایسے بھی ہیں جن میں دوسرے ذرائع سے خصوصیتوں کا مجتہدین نے پتہ چلایا ہے، اور بھی از این قبیل بیسیوں باتیں ایسی ہیں کہ حدیث سننے کے بعد کسی شخص کا یہ سوال کہ "خود آپ کا کیا خیال ہے؟" ہمیشہ بے محل سوال نہیں ہو سکتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ اس راز کا جاننے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ "قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم" سننے کے بعد اس شخص کا "القول بہذا" (کیا آپ بھی اسی کے قائل ہیں؟) کہنا امام شافعی کو مضطرب کر دیتا ہے سائل کو کہتے ہیں:۔

یا ھذا ارأیت فی وسطی زنارا، ارأیتنی خارجا من کنیسۃ اقول قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتقول لی اتقول بھذا؟ (توالی ص۶۔)	بھلے آدمی! کیا تو نے میری کمر میں زنار دیکھا، یا کیا تو نے مجھے کسی گرجے سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے؟ میں نے تجھ سے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے اور تو مجھ سے کہتا ہے کہ کیا تمہارا بھی یہی فتویٰ ہے؟

کھلی ہوئی بات ہے کہ نفس سوال پر آپ کا اعتراض نہ تھا بلکہ آپ کو مسلمانوں کے اس رجحان نے بے کل اور بے چین کر دیا تھا کہ بجائے پیغمبر کے اپنے اطمینان کے لیے کسی دوسرے کی رائے ڈھونڈتے ہیں۔ اس کا انجام آئندہ جو کچھ ہو سکتا تھا دراصل یہی چیز ان کے لیے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی چیزیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن سر دست ان ہی چیزوں پر قناعت کرتے ہوئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان حقائق و واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر یہ نتیجہ پیدا کیا جائے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد امام مالک اور مسلمانوں کے دوسرے امام، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی مکاتب خیال کے ہوتے ہوئے ایک تیسری راہ جو الگ بنائی تو اس کی غرض یہ نہ تھی کہ وہ خواہ مخواہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا چاہتے تھے۔ بھلا جو بار بار اپنے اس خیال کو عام مجمعوں میں دہراتا ہو کہ

ودِدتُ لو ان الناس کتبوا کتبی و تفقھوا بھا ثم لم ینسبوھا الی۔ (توالی ص۶۔)	اگر لوگ میری کتابوں کو لکھ لیں اور ان سے تفقہ حاصل کریں اور پھر میری طرف منسوب بھی نہ کریں تو میں اس کی پروا نہیں کرتا

اور جس کی زبان سے یہ بات ادا ہوئی ہو کہ

یقولون انی انما خالفتھم للدنیا وکیف	معترضین کہتے ہیں کہ میں ان کی مخالفت صرف دنیا حاصل

یکون ذالک الذی نیامعهم (تواں مت)   کرنے کے لیے کرتا ہوں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ دنیا نبی کے ساتھ ہے

ظاہر بات ہے کہ حکومت میں رسوخ تو ان ہی علماء کو حاصل تھا جو ان دونوں اماموں (مالک و ابوحنیفہ) کے مقلد تھے
اس لیے دنیا میں ترقی چاہنے والے کے لیے اس زمانہ میں تو کھلی ہوئی راہ یہ ہی تھی کہ وہ ان علماء کی ہمنوا
ہو جاتا، نہ کہ ان کی مخالفت کر کے اپنی قدر و عزت کو ان کی نگاہوں میں گراتا ـــــــــ اور جس طرح یہ
غلط ہے اسی طرح میرے نزدیک یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہ وغیرہ ائمہ کے اجتہادی مسائل
قطعاً بے بنیاد اور غلط سمجھتے تھے. امام مالک تو ان کے اُستاذ ہی تھے. اور کیسے اُستاذ؟ مصر جہاں امام شافعی نے اپنی
زندگی کے آخری تین چار سال گزارے وہاں بھی ان کی زبان پر زیادہ تر یہی فقرہ رہتا تھا

ھذا قول الاستاذ یرید مالکاً (توالی ص ۲۰) | یہ میرے اُستاذ کا قول ہے (اشارہ امام مالک کی طرف ہوتا)

اور یہی حال ان کا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھا. انہی کا مشہور جملہ ہے

الناس عیالٌ فی الفقہ علی ابی حنیفۃ   تمام لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے محتاج ہیں.

اور اس واقعہ سے کون واقف نہیں کہ امام ابوحنیفہ کے مزار پر جب امام شافعی پہونچے تو انھوں نے مسئلہ قنوت
اور رفع الیدین میں امام ابوحنیفہ کے مسلک کو اختیار کیا. جب پوچھا گیا تو فرمایا "ادبا لہذا الامام" (اس امام
کا ادب کرتے ہوئے میں نے ایسا کیا ہے.)

جو واقعہ وہی تھا کہ تقلید میں بے اعتدالی کا جو خطرناک انجام ہو سکتا تھا بس اسی کا سد باب
اس جد و جہد سے مقصود تھا وہ چاہتے تھے کہ ان ہی مسائل کو جنھیں لوگ آج اپنے اپنے اساتذہ کی طرف
منسوب کرتے ہیں ضرورت ہے کہ ان کو اُن کے اصل ماخذوں پر پیش کر کے پھر ان کی تنقید اور تنقیح کی
جائے اس لیے کہ ان اماموں نے بھی جو کچھ کہا تھا ظاہر ہے اپنے دل سے تو نہیں کہا تھا مگر رواج ہی ہو گیا
تھا کہ تابعین اپنے صحابی اساتذہ کی طرف اور تابعین کے شاگرد (تبع تابعین) اپنے تابعی اُستاذوں کی طرف
اقوال کو منسوب کرتے چلے آرہے تھے. ظاہر ہے کہ اس چلن کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جاتا جیسے وہ بڑھتا
چلا جا رہا تھا تو کیا تعجب کی بات ہوتی کہ اسلام کے سامنے بھی وہی صورت نہیں آجاتی جس کی طرف قرآن نے
ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابًا من دون اللہ (التوبۃ ۵)	انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا رکھا ہے.

جن نے۔ جو یہ شہادتیں دوسری صدی ہجری کے متعلق پیش کی ہیں ان کے پڑھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس خطرہ کا احساس اگر امام شافعی کو ہوا تو یقیناً ان کی ایمانی بصیرت اور خداداد فراست سے اسی کی توقع ہو سکتی تھی۔

اگرچہ ہر ہر مسئلہ کے متعلق شریعت کے حقیقی ماخذوں سے ثبوت پیش کرنا آسان نہ تھا لیکن امام شافعیؒ کو تفقہ فی الدین کے مختلف مکاتب خیال کے فراقی تجربہ کا جو موقعہ ملا تھا اور خدا نے جس قسم کی ذکاوت ان میں پیدا کی تھی اس نے اس مسئلہ کو ان کے لیے نسبتاً آسان کر دیا تھا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جنھیں امام شافعی سے بھی تلمذ کی نسبت تھی وہ فرماتے تھے کہ

قلت للشافعی ما تقول فی مسئالة کذا وکذا قال فاجاب منها فقلت من این قلت هل فیه حدیث او کتاب قال بلی فی ذالک حدیث للنبی صلی اللہ علیه وسلم هو حدیث نص (الخطیب البغدادی ج [illegible])

میں نے امام شافعی سے کہا کہ آپ فلاں فلاں مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں انھوں نے ان کے جوابات دیئے تب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ کہاں سے فرمایا، کیا اس مسئلہ میں کوئی حدیث ہے یا قرآن کی کوئی آیت ہے؟ امام نے کہا کہ ہاں اس مسئلہ کے بارے میں نبی کریم صلعم کی یہ حدیث ہے، اور واقع میں وہ حدیث اس مسئلہ میں نص ہوتی تھی۔

ذخیرہ حدیث کے متعلق جو تبحر امام احمد بن حنبل کو حاصل ہے۔ جو اس سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس حدیث کو امام شافعی نے اس مسئلہ کا ماخذ قرار دیا ہوگا یقیناً امام احمد اس سے ناواقف نہ ہونگے لیکن یہ بات کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہو سکتا ہے، ادھر ان کا ذہن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منتقل نہ ہوا تھا۔ امام شافعی نے سچ پوچھیے تو اسی استنباطی کمال میں ملکہ حاصل کیا تھا اور اسی غرض سے یہ ملکہ حاصل کیا تھا کہ مسلمانوں کو دین کے حقیقی سرچشمہ کی طرف پھر واپس لے جائیں۔ امام احمد ہی سے امام شافعی کے متعلق جو یہ قول کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے:-

الشافعی من اشرح الناس للحدیث وکان له اختراع حسن (توالی ص [illegible])

شافعی حدیث کے بہترین شارح تھے، اور اس باب میں ان کی اپج بہت اچھی تھی۔

نیز انہی سے یہ بھی منقول ہے۔ ما رأیتُ احداً افقه فی کتاب اللہ من هذا الفتی (توالی ص [illegible])

کتاب اللہ کے سمجھنے میں اس نوجوان (امام شافعی) سے زیادہ سمجھنے والا آدمی میں نے نہیں دیکھا۔

دراصل میں بھی امام شافعی کے اسی ترکہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کتاب و سنت نتائج کے استنباط میں انھوں نے حاصل کیا تھا۔

(باقی)

حدیث اور اصحاب حدیث پر امام شافعی کے اس اقدام کا اثر

امام شافعی کی توجہ جب ادھر مبذول ہوئی اور مسلمانوں کی دینی زندگی کو اسلام کے اساسی ماخذوں اور حقیقی سرچشموں پر پیش کرنے اور قال اصحابنا کی عادت سے ہٹا کر قال اللہ اور قال الرسول کا عادی ان کو بنانے کے عزم کو لیکر امام ممدوح دوسری صدی ہجری کے اواخر میں جب اٹھے ہیں تو سب سے زیادہ مسرت کی لہر اس سلسلے اہل علم کے جس طبقہ میں دوڑ گئی وہ بیچارے محدثین کا طبقہ تھا۔ کہ اب تک اپنی عملی زندگی میں نہ عام مسلمان ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور نہ حکومت ہی اپنے محاکم عدل و دفاتر مظالم وغیرہ میں ان سے کام لیتی تھی بلکہ ان تمام امور میں جیسا کہ گذر چکا عوام اور حکومت دونوں کا دار و مدار فقہا ہی پر تھا۔ لیکن جب امام شافعی کی طرف سے ردِّعمل اور اصلاح و تجدید کی یہ آواز بلند ہوئی تو قدرتی طور پر قرآن کے بعد السنۃ یعنی حدیثوں کی ضرورت پیش آئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی حدیثوں کو جنہیں بیچارے محدثین روایت کرتے تھے لیکن ان سے کن کن مسائل کا ثبوت فراہم ہو سکتا ہے اس سے نہ ان کو زیادہ دلچسپی تھی اور نہ امام شافعی سے پہلے اس شان کے ساتھ کسی نے اس کا ارادہ کیا تھا مگر جب ان ہی حدیثوں سے امام نے فقہی جزئیات کو مستنبط کر کے دکھانا شروع کیا تو حدیث کی دنیا میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس قسم کے اقوال جو امام شافعی کے متعلق کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً امام احمد فرماتے ہیں :۔

لولا الشافعی ما عرفنا فقہ الحدیث — اگر شافعی نہ ہوتے تو ہم (محدثین) کو یہ بات معلوم ہوتی کہ فقہ حدیث کیا چیز ہے یعنی حدیث سے مسائل کا استنباط کیسے کیا جاتا ہے

یا ربیع بن سلیمان مرادی کا قول تھا۔

اصحاب الحدیث لا یعرفون تفسیر الحدیث حتی جاء الشافعی — حاملان حدیث کا طبقہ حدیث کی تفسیر سے نا آشنا تھا یہاں تک کہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ دنیا میں تشریف لائے۔

یا الزعفرانی کہتے ہیں :۔

کان اصحاب الحدیث رقوداً حتی ایقظھم الشافعی — اصحاب حدیث سب کے سب سو رہے تھے امام شافعی نے ہی آکر ان کو بیدار کیا۔

یا احمد بن سنان کا ارشاد ہے کہ

لولا الشافعی لاندرس العلم بالسُّنَن — اگر امام شافعی نہ ہوتے تو احادیث (السنہ) کا علم مٹ جاتا

یا ابو حاتم رازی کہتے تھے۔

لولا الشافعی لکان اھل الحدیث فی عمیً — اگر حضرت شافعی نہ ہوتے تو اصحاب حدیث نابینائی میں رہتے۔

ارباب حدیث کے دائرے میں تو اعتراف و امتنان کے یہ چرچے تھے۔ دوسری طرف حضرت امام ان محدثین کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں:۔

جزاھم اللہ خیراً ھم حفظوا لنا الاصل فلھم علینا الفضل (توالی) ص ۵۷ — اللہ تعالیٰ ان محدثین کو جزائے خیر دے انہوں نے ہمارے لئے اصل (سنت) کی حفاظت کی اسلئے انہیں ہم پر برتری حاصل ہے۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے محدثین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے ایسی حالت میں جب کہ نہ حکومت ہی میں ان کی کسی قسم کی پرسش تھی اور نہ عوام ہی اپنی عام زندگی میں ان سے مسئلے مسائل پوچھتے تھے۔ لے دے کر ان کا احترام فقط اس لئے کیا جاتا تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور عہد نبوت و صحابہ کے واقعات کے یہ محافظ ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ عملی زندگی میں حکومت و رعایا دونوں کا فقہا کی طرف جو شدید احتیاج تھا اور اس احتیاج نے ان کے مقام کو جتنا بلند کر رکھا تھا یہ بات ان محدثین کو کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔ یقیناً مسلمانوں کی طرف سے محدثین کا طبقہ ہر قسم کے شکریہ کا مستحق ہے کہ باوجود ان ناموافق حالات کے ان پاک نفس بزرگوں نے اللہ و رسول کی محبت ہی کی وجہ سے اپنی ساری زندگی ذخیرہ حدیث کے جمع کرنے میں صرف کر ڈالی، اور تقریباً دو سو برس کے بعد، اس وقت جبکہ اسلام کے ایک امام نے ضرورت محسوس کی کہ مسلمانوں کے دین کو پھر اصل پر پیش کر کے جانچا جائے تب ان محدثین کی محنت کی قیمت پیدا ہوئی، محدثین کی طرف سے اس قسم کے اعترافات امام شافعی کے متعلق جو پائے جاتے ہیں کہ مثلاً امام احمد فرماتے تھے:۔

رحمہ اللہ الشافعی کان یذب عن الآثار — اللہ تعالیٰ امام شافعی پر رحمت فرمائے وہ حدیثوں کی طرف سے مدافعت کرتے تھے (یعنی جو اعتراضات حدیث پر وارد ہو سکتے تھے ان کا ازالہ کرتے)

یا ان کو انہی محدثین نے ناصر الحدیث، اسد السنہ وغیرہ مختلف خطابات اور القاب سے جو سرفراز کیا ہے تو در اصل اس کی یہی وجہ تھی جو میں نے بیان کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کو پھر دین کے حقیقی ماخذوں پر پیش کر کے جانچنا اور تنقید کی

بے اعتدالیوں کی وجہ سے مسلمان اپنے دین کے اصلی سرچشموں سے جو دور ہو چلے تھے پھر ان ہی کی طرف ان کو واپس کر دینا یہ تھا وہ حقیقی نصب العین جو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر تھا۔ اصلاح وتجدید کی اس مہم میں جس ساز وسامان کی ضرورت تھی میں بیان کر چکا ہوں کہ حق تعالیٰ نے امام شافعی کے لئے سب کو جمع کر دیا تھا۔ وہ قرآن کے بہت بڑے عالم تھے۔ حدیث کے بھی بڑے بڑے اساتذہ سے انہوں نے اس سرمایہ کو محفوظ کیا تھا۔ اور قطع نظر خود ایک قریشی لنسل خالص عرب ہونے کے لغت عربی میں کمال پیدا کرنے میں بھی انہوں نے پوری کوشش کی تھی، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اجتہاد وتفقہ کے مالکی وحنفی دونوں مکاتب خیال جن کے عموماً اس زمانہ میں مسلمان متبع تھے ان میں سے فقہ مالکی کے اسرار ورموز سے گہری ماہرانہ واقفیت کا موقعہ تو ان کو خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہی سے براہِ راست ملا تھا اور گو امام ابو حنیفہ کی صحبت ان کو میسر نہ آسکی لیکن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے حنفی نقطۂ نظر کا علم جس طریقے سے انہوں نے حاصل کیا تھا وہ یقیناً کافی تھا۔ اسی کے ساتھ ہمیں امام شافعیؒ کی اس خصوصیت کو بھی بھولنا نہ چاہیئے کہ ائمۂ اسلام میں یہی پہلے امام ہیں جن کو قبل الاسلام کے ان علوم وفنون کے سیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ جو یونانی اور سریانی جیسی تصنیفی وتالیفی زبانوں میں پائے جاتے تھے اور یہ بھی ایک قدرتی امداد تھی جو امام کے مجتہدانہ کاروبار میں بڑی معاون ہوئی۔

امام کا اصلی کارنامہ یہ مسئلہ کہ انہوں نے اپنے مذکورہ بالا نصب العین کی تکمیل میں کیا کیا اور اس کی نوعیت کیا ہے، ایک بڑی طویل بحث ہے جس کی تفصیل کا ظاہر ہے کہ یہاں موقع نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ حجاز سے وہ بغداد پہلی دفعہ آئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زیادہ وقت عراقی یا بالفاظ دیگر حنفی فقہ کی تحقیق وتفتیش میں گذرا۔ حافظ ابن حجر راوی ہیں۔

والذی تحرر لنا بالطرق الصحیحۃ ان قدوم الشافعی بغداد اول ما قدم کان سنۃ اربع وثمانین (یعنی بعد المائۃ) وکان ابو یوسف قد مات قبل ذالک بسنتین وانہ لقی محمد بن حسن فی تلک القدمۃ وکان یعرفہ قبل ذالک من الحجاز واخذ عنہ ولازمہ (توالی ص۶)

جو بات صحیح طریقوں سے مجھے معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ امام شافعی بغداد میں پہلی دفعہ ۱۸۴ھ ہجری میں آئے۔ امام ابو یوسف کا اس سے دو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن انہوں نے امام ابو حنیفہ کے دوسرے شاگرد رشید محمد بن حسن سے ملاقات کی اور اس سے پیشتر وہ حجاز ہی سے ان کو جانتے بھی تھی، بہرحال انہیں امام محمد سے علم حاصل کیا اور ان کی صحبت اختیار کی

امام محمد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے خوشگوار تعلقات اور افادہ و استفادہ کے قصوں کو مورخین نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قانون اسلامی کے اس ساری مجموعہ کو جسے امام ابو حنیفہ کی مجلس شوریٰ نے بیس سال میں مرتب کیا تھا اور امام محمد نے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے بعد کو مہذب کر کے تقریباً نو سو رسالوں یا کتابوں کی شکل میں اس مجموعہ کو مدون کیا تھا (اور آج تک فقہ حنفی میں کتاب الطہارت، کتاب الصلوٰۃ کے الفاظ ان ہی کی کتابوں کی یادگار چلی آرہی ہے) تو امام محمد کی ان مدونہ کتابوں کو امام شافعی نے اپنے لئے نقل کر لیا تھا۔ خود امام شافعی کے حوالے سے حافظ ابن حجر نے یہ نقل کیا ہے کہ:۔

قال الشافعی لم یزل محمد بن الحسن عظیماً جلیلاً عندی انفقت علی کتبہ ستین دیناراً (توالی) ص۵۶)

امام شافعی نے کہا کہ امام محمد کا مرتبہ میرے نزدیک ہمیشہ بہت بڑا رہا۔ میں نے ان کی کتابوں پر (نقل کرانے میں) ساٹھ اشرفیاں خرچ کیں۔

ان ہی کتابوں کے نقل کے سلسلہ میں ایک لطیفہ یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ شاید امام محمد نے اپنی کسی کتاب کے دینے میں ذرا اغماض سے کام لیا۔ امام شافعی نے ایک منظوم رقعہ چند اشعار کا ان کے نام لکھا جس کا ایک شعر یہ بھی تھا۔

العلم ینھی اھلہ ÷ ان یمنعوہ اھلہ

علم علم والوں کو اس سے منع کرتا ہے ÷ کہ جو علم کے اہل ہیں ان سے اس کو روکا جائے

امام شافعی کا بیان ہے کہ رقعہ کے ساتھ ہی

فحمل محمد الکتاب فی کمہ وجاء الی معتذراً۔ (توالی) ص۵۵)

امام محمد اسی وقت کتاب اپنی آستین میں رکھ کر میرے پاس آئے اور معذرت خواہی کرتے ہوئے مجھے دے دی۔

بہر حال امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے "فقہ حنفی" کے اس سرمایہ کو براہ راست امام محمد سے سمجھا بھی اور سمجھنے کے بعد انہوں نے اس کی نقل بھی حاصل کی اس کے بعد آپ بغداد سے پھر حجاز اور یمن وغیرہ کی طرف چلے گئے۔ اس عرصہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حنفی فقہ کی کتابوں میں غور و خوض کا سلسلہ برابر جاری رہا خود ان ہی سے مروی ہے

کتبت لی کتب محمد بن الحسن فنظرت فیھا سنۃ حتی حفظتھا۔ توالی ص۷۶

امام محمد کی کتابیں میرے لئے نقل کرائی گئیں ایک سال تک میں ان کا مطالعہ کرتا رہا اس طور پر کہ مجھے وہ سب یاد ہو گئیں

بہر حال ایک طرف تو امام شافعی نے خود امام مالک سے براہ راست ان کا علم حاصل کیا اور ایسا حاصل کیا کہ خود امام مالک کا یہ اعتراف ان کے حق میں ہے کہ۔

ما اتیتی قریشیٌ افہم من ھذا الفتی (توالی ص۵۳) اس نوجوان سے زیادہ سمجھ بوجھ والا کوئی قریشی میرے پاس نہیں آیا اور دوسری طرف بغداد پہنچ کر فقہ حنفی کے سرمایہ پر بھی انہوں نے قابو حاصل کیا۔ پھر ان دونوں فقہوں کے مسائل پر وہ اس حیثیت سے غور کرتے رہے کہ بجائے ائمہ کی طرف منسوب کرنے کے ان کے مسائل و جزئیات کتاب و سنت سے کہاں تک ثابت کئے جاسکتے ہیں۔ دعویٰ دوسروں سے لینا اور دلیل اپنی طرف سے اس کے لئے فراہم کرنا ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا۔ امام شافعی کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ دن تو خیر دن ہی تھا راتوں کو بھی امام کا یہ حال تھا کہ بظاہر سونے والوں کی شکل بنا کر پلنگ پر لیٹ جاتے لیکن تھوڑی دیر بعد اپنی جاریہ کو حکم دیتے کہ :-

یا جاریۃ قومی فاسرجی فتسرج لہ	اٹھکر ذرا چراغ روشن کردو، اٹھکر چراغ جلاتی امام
فیکتب ما یحتاج الیہ ثم یطفی السراج	اُٹھتے اور کچھ لکھتے اور پھر چراغ گل کر دیتے :-

گویا کہ رات بھر یہی سلسلہ جاری رہتا کہ چراغ جلایا جاتا لکھتے پھر بجھا دیتے۔ پھر جلتا اور پھر بجھایا جاتا ان کے شاگرد ربیع کا بیان ہے کہ ایک دن میں نے عرض کیا کہ آپ کا یہ طریقۂ کار (یعنی بار بار چراغ جلانے کے لئے جاریہ کو اُٹھانا) اسکے لئے باعث مصیبت ہے (غالباً ان کا مطلب یہ تھا کہ ایسا کیوں نہ ہو کہ چراغ برابر جلتا ہی رہے اور آپ جب چاہیں اٹھ کر لکھتے پڑھتے رہا کریں) حضرت امام نے اس کے جواب میں فرمایا۔

ان السراج یشغل قلبی	چراغ میرے قلب کو پراگندہ کرتا ہے

یعنی روشنی سے دماغ منتشر ہوجاتا ہے' اور بھی اس قسم کے واقعات ان کی عجیب و غریب محنت کے اس باب میں نقل کئے جاتے ہیں' بہرحال یوں جب پورے طریقہ سے اپنے آپ کو انہوں نے تیار کرلیا تب جہاں تک میرا خیال ہے اپنی اصلاحی مہم کے لئے پہلے حنفیوں کے مرکزی شہر بغداد کو آپ نے تاکا گو مالکیوں کے زیر اثر بھی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس زمانہ میں تھی اور ایک مستقل حکومت (اندلس والی) نے مالکی فقہ کو اپنی حکومت کے قانون کی حیثیت سے جیسا کہ گذر چکا ہے نافذ بھی کر دیا تھا۔ لیکن فقہ حنفی اپنے متبعین کی کثرت تعداد کے لحاظ سے بھی اور اس لئے بھی کہ جس حکومت کا قانون حنفی فقہ بن گیا تھا اندلس کی اموی حکومت اس کے مقابلہ میں اتنی اہمیت نہیں رکھتی تھی جس کے وجوہ ظاہر ہیں۔ الغرض کچھ اسی قسم کے اسباب و وجوہ تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام کو پہلے،

بغداد کی طرف متوجہ کیا۔ یہ ۱۹۵ھ ہجری کا زمانہ ہے۔ امام محمد بن الحسن کا اب انتقال ہو چکا تھا۔ امام شافعی نے اب کی دفعہ بغداد پہنچ کر پہلا کام تو وہی کیا جس کا ذکر گزر چکا۔ یعنی جامع بغداد میں ایک حلقہ درس قائم کیا جس کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ بجائے "قال اصحابنا" کے جس مسئلہ اور جس بات کا بھی ذکر کیا جاتا تھا وہ "قال اللہ وقال الرسول" کے حوالہ سے کیا جاتا تھا۔ قدرتاً لوگوں کو یہ طریقہ نیا معلوم ہوا۔ شروع میں جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے بعض لوگ بطور مذاق یا تفنن طبع کے اپنے پرانے مشہور اساتذہ کے حلقہ کو چھوڑ کر اس نئے حلقے میں شریک ہوتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان بہرحال مسلمان تھے۔ اللہ و رسول کی طرف ان کا جھک جانا ایک طبعی بات تھی۔ اجن لوگوں کا بیان ہے کہ آخر میں امام شافعی والے حلقے کے سوا جامع بغداد میں کوئی دوسرا حلقہ باقی نہ رہا تھا تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیئے۔

اس درسی کاروبار کے علاوہ دراصل ان کا اس سے زیادہ حقیقی ٹھوس ایک دوسرا کام بھی تھا۔ میرا اشارہ اس سے ان کی کتاب الحجۃ نامی کی طرف ہے جس کا حوالہ بعد کی کتابوں میں "الکتاب البغدادی" یا "الکتاب القدیم" کے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ امام شافعی نے بغداد میں کوئی مستقل کتاب فقہ کی لکھی تھی اور اس کا نام "الکتاب البغدادی" یا "القول القدیم" ہے۔ حالانکہ میں نے جیسا کہ عرض کیا حضرت امام کا کام کسی مستقل فقہ کا پیدا کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ان کے سامنے تو فقہ کے اس سرمایہ کی جو اس وقت تک تیار ہو چکا تھا۔ بس اس کی تنقید تھی۔ اور جن مسائل کو اب تک لوگ محض اسلئے مانتے چلے آتے تھے کہ وہ ان کے استاذ یا استاذ الاستاذ وغیرہ کا قول ہے۔ امام نے ان ہی مسائل کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں جانچنا چاہا۔ اس سلسلہ میں پہلا کام انہوں نے فقہ حنفی کی تنقید کا بغداد (یعنی حنفیوں کے مرکزی اور حکومتی شہر) میں بیٹھ کر انجام دیا۔ حافظ ابن حجر نے خود ان ہی کے حوالے سے ان کے اس قول کو نقل کرتے ہوئے جس کا ذکر پہلے بھی آیا ہے یعنی

کتبت کتب محمد بن الحسن فنظرت	امام محمد کی کتابیں میرے لئے نقل ہوئیں اور میں نے
فیھا سنۃ حتی حفظتھا	ایکسال ان کا مطالعہ کیا یہاں تک وہ مجھے محفوظ ہو گئیں

اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ امام نے فرمایا۔

ثم وضعت الکتاب البغدادی "یعنی الحجۃ"	پھر میں نے کتاب البغدادی یعنی الحجۃ لکھی۔

جس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہوا کہ انہوں نے امام محمد کی کتابوں کی تنقید کے متعلق جو کام کیا تھا اس کا نام "الکتاب البغدادی" یا "الحجۃ" ہے۔ امام شافعی نے اپنی اس کتاب "الحجۃ" کو کس طریقہ سے لکھا تھا حافظ ہی نے ان ہی کے حوالہ سے اس سوال کا جواب نقل کیا ہے کہ امام شافعی نے یہ بتلانے کے بعد کہ میں نے امام محمد کی کتب کی نقلوں کے حاصل کرنے پر ساٹھ اشرفیاں خرچ کیں اور اس کے بعد فرمایا کہ

ثم تدبرتها فوضعت الی جنب کل مسئلة حدیثا (توالی ص۶۶)

میں نے ان کتابوں کا خوب گہرا مطالعہ کیا اور ہر ہر مسئلہ کے پہلو میں ایک ایک حدیث درج کرتا چلا گیا

بعض لوگوں نے اس فقرہ کا یہ عجیب مطلب لکھا ہے کہ ہر مسئلہ کی تردید میں امام نے حدیث پیش کی تھی، حالانکہ اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو حنفی فقہ کے ہر ہر مسئلہ سے اختلاف تھا جو ظاہر ہے کہ بداہت کے خلاف ہے۔ زیادہ تر مسائل میں تو ائمہ کا اتفاق ہی تھا۔ بلکہ بات وہی ہے کہ انہوں نے فقہ حنفی کی تنقید کتاب وسنت کی روشنی میں کی تھی۔ چونکہ بلاشبہ ان کی تنقید آزاد تنقید تھی اس لئے اتفاق بھی کرتے تھے اور اختلاف بھی کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو دعووں کا نہیں بلکہ دلیلوں کا پابند بنایا تھا پس جو بات ان کے معلومات کے لحاظ سے دلیل کے مطابق نظر آتی تھی وہی لکھ دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا طریق عمل یہ بھی تھا کہ جن مسائل کے متعلق ان کو موافق یا مخالف دونوں پہلوؤں کے متعلق دلائل کے لحاظ سے اطمینان نہ ہوتا تو اپنی تنقید میں لکھ دیتے تھے۔ کہ بالفعل ہمارے پاس کوئی صحیح حدیث تو اس مسئلہ کے متعلق نہیں ہے لیکن آئندہ اگر کسی کو کوئی صحیح حدیث مل جائے تو اسی کو ترجیح دینی چاہیئے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان کی کتاب میں اس قسم کی معلق اور مشروط تنقیدوں کا ایک بڑا حصہ ہے حافظ کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

وقد اکثر الشافعی فی تعلیق القول بالحکم بثبوت الحدیث عند اهله (توالی ص۶۲)

امام شافعی نے بکثرت ایسی صورتیں اختیار کی ہیں کہ مسئلہ کے متعلق حکم کو اس پر موقوف کر دیتے تھے کہ جب حدیث والوں کے پاس کوئی حدیث ثابت ہو جائے یعنی حدیث سے جو حکم ثابت ہو بس اسی کو صحیح حکم سمجھنا چاہیئے

امام شافعی کی ان معلق تنقیدوں کو حافظ ہی نے ایک مستقل کتاب میں جمع بھی کرنا چاہا۔ لکھا ہے

قد جمعت فی ذالک کتابا سمیته المنحه فما علق الشافعی القول به علی الصحة وارجوا الله

میں نے امام شافعی کی ان معلق تنقیدوں کو جمع کیا ہے اور اس کا نام "المنحۃ فیما علق الشافعی القول بہ علی الصحۃ" رکھا ہے اور میں اللہ

تیسیر تعمیلہ بعونہ وقوتہ کی رحمت سے امید کرتا ہوں کہ اسکی مدد اور قوت سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گا

بہرحال یہ دعویٰ کہ امام شافعی نے امام محمد کی کتابوں کے ہر ہر مسئلہ کا رد اپنی کتاب میں لکھا ہے قطعاً غلط ہے۔ بلکہ بات وہی ہے جو ہر آزاد تنقید میں پیش آسکتی ہے یعنی بعض امور میں موافقت، اور بعض میں مخالفت اور جن مسائل کے متعلق ان کے معلومات میں موافقانہ یا مخالفانہ مواد نہ تھا اسمیں تعلیق۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس کام کی تکمیل تو امام شافعی نے امام محمد بن حسن کی وفات کے بعد کی لیکن اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کو وہ امام محمد پر بھی پیش کر چکے تھے۔ اس سلسلہ میں دونوں کے مناظروں اور مباحثوں کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ تنقید کی اس راہ میں خدا نے جو غیر معمولی صلاحیت امام شافعی میں پیدا کی تھی اس کا اندازہ امام محمد کو بھی اپنی زندگی ہی میں ان ہی مباحثوں اور مناظروں کے تجربے سے ہو گیا تھا بلکہ خود امام شافعی سے یہ قول نقل کیا جاتا ہے۔

سمعت محمد بن الحسن مالا احصیہ	میں نے امام محمد بن الحسن کو بارہا کہتے سنا وہ اپنے
یقول لاصحابہ ان تابعکم الشافعی	تلامذہ سے فرمایا کرتے کہ اگر شافعی تمہاری موافقت
فما علیکم من حجازی بعد کلفۃ (توالی ۵۵)	کریں تو پھر کسی حجازی سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔

عراقی جو فقہار کوفہ یا احناف کی دوسری تعبیر تھی اس کے مقابلہ میں فقہ مالکی کے فقہار کو اس زمانہ میں حجازی کہتے تھے مطلب امام محمد کا یہ تھا کہ اگر امام شافعی تمہارے (حنفی فقہ کے علمار) ساتھ ہو جائیں تو پھر مالکی علمار کے اعتراضات کی تمہیں پرواہ کرنی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ امام شافعی کی قوت تنقید کی گہرائی کا یہ کھلا ہوا اعتراف امام محمد کیطرف سے ہے۔ اس لئے بطور سند کے امام شافعی اس کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ ہر ہر مسئلہ میں خواہ مخواہ امام شافعی حنفی نقطۂ نظر کے مخالف نہ تھے بلکہ جن لوگوں نے امام شافعی کے "قول قدیم" یعنی کتاب الحجۃ" کے مسائل کا تتبع کیا ہے اور آج بھی "قال الشافعی فی القدیم" کے الفاظ میں انکے جس مسلک کا تذکرہ مختلف مسائل کے متعلق کیا جاتا ہے ان کو سامنے رکھنے کے بعد صاف نظر آتا ہے کہ اس کتاب میں زیادہ تر ان کا رجحان بہ نسبت مالکیوں کے یا دوسرے فقہار کے اقوال کے حنفی نقطۂ نظر کی موافقت کی طرف زیادہ ہے،

البتہ جب فقہ حنفی کی تنقید سے فارغ ہونے کے بعد اب خود اپنے دوسرے استاد امام مالک کی فقہ کی تنقید کی مہم پر وہ آمادہ ہوئے تو جس طرح حنفی فقہ پر کام کرنے کے لئے ان کو موزوں جگہ بغداد محسوس ہوئی تھی اسی طرح غور و فکر کے بعد ان کو نظر آیا کہ فقہ مالکی کی تنقید کیلئے مناسب مقام مصر ہے۔ اس زمانہ میں مالکی علماء کا مرکز مصر ہی تھا۔ وہیں ابن وہب۔ اشہب ابن اصبغ وغیرہم امام مالک کے اجلّہ تلامذہ کا ٹھکانا تھا غرض میرے خیال میں اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر بغداد سے آپ مصر روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر آپ نے مالکی فقہ کی تنقید پر کتاب لکھی اور یہی کتاب اور اس کے مسائل "قول جدید" کے نام سے مشہور ہیں۔

جہاں تک میں خیال کرتا ہوں بغداد میں ان کو چونکہ اپنے ہر تنقیدی مسئلہ پر علماء احناف سے بحث و مناظرہ کا موقع ملتا تھا اس لئے جیسا کہ میں نے عرض کیا اپنے قول قدیم یعنی بغدادی کتاب "الحجۃ" میں مخالفت سے زیادہ فقہ حنفی کے مسائل سے موافقت کا پہلو ان پر غالب رہا ہے، لیکن جب مصر آئے اور یہاں علماء مالکیہ سے آکر معرکہ ہوا تو ان کو اپنے بہت سے "بغدادی" خیالات سے رجوع کرنا پڑا۔ جس طرح انہوں نے دوسروں کے اقوال کی تنقید کی تھی۔ خود اپنے اقوال کے ساتھ اس اصول کے برتنے میں پس و پیش کیسے کر سکتے تھے۔ بیسیوں مسائل میں ان کو اپنی پہلی تحقیق کے خلاف رائے قائم کرنی پڑی جس کا تذکرہ عام طور سے کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ آخری کتاب مصر میں ان کی "الام" ہے اور یوں سمجھنا چاہیئے کہ "الحجۃ" جیسے فقہ حنفی کی تنقید ہے "کلام" مالکی فقہ کی تنقید ہے یہ ہی خلاصہ ان کے کارناموں کا جو اپنے تنقیدی نصب العین کے سلسلہ میں انہوں نے انجام دیا۔

یہ بات کہ امام اپنی اس تنقیدی مہم میں کس حد تک کامیاب ہوئے خود ایک تنقیدی سوال ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا طے کرنا آسان بھی نہیں ہے۔ اور نہ اس کی یہاں گنجائش ہے، لیکن قطع نظر اس سے میرے نزدیک حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلمانوں پر قیامت تک کے لئے احسان رہ گیا کہ اسلام میں تقلیدیہ کے اس مہلک جاں گداز خطرہ کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسداد ہو گیا۔ جس کی شکار دنیا کی دوسری قومیں ہو ہو کر اپنی سماوی کتابوں اور اپنے رسولوں سے بچھڑتی چلی آئی تھیں۔

"پلٹو! طرف اپنی کتاب اور سنت رسول کے" امام نے یہ ایک ایسی آواز اسلام کی دوسری صدی کے

اختتام سے پہلے ہی اتنی قوت سے بلند کی کہ اسلام کا سارا محروسہ تھرّا اٹھا۔ لوگوں نے ان کی تنقیدوں کو مانا یا نہ مانا یہ تو دوسری بات ہے لیکن ہر مکتب خیال میں اس کا احساس ضرور پیدا ہو گیا کہ صرف اساتذہ کے اقوال پر بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ بلکہ اپنے دین کو کتاب وسنت پر بھی جانچتے رہنا چاہیئے۔

امام شافعی کے بعد ہی حنفیوں میں قاضی بکار، ابن قتیبہ۔ ابوجعفر طحاوی جیسے جلیل القدر محدثین پیدا ہوئے جنھوں نے فقہ حنفی کو کتاب وسنت کی روشنی میں جانچ کر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور انکے بعد بھی بحمداللہ ہر صدی میں ایسے علماء پیدا ہوتے رہے جن کا سلسلہ اب تک باقی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک باقی رہے گا۔

یہی حال موالک کا بھی ہے بلکہ تنقیدی فقہ کی کتابیں مالکی مذہب میں شاید حنفیوں سے زائد ہی نکل سکتی ہیں۔

اور یہ حال تو ان لوگوں کا ہوا جنھوں نے امام شافعی کی تنقیدوں کو تسلیم نہیں کیا، باقی جن بزرگوں نے مان لیا جنھیں ہم اب شوافع یا شافعیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں یعنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقلدوں میں جو سمجھے جاتے ہیں ان میں تو تنقید کا یہ مذاق گویا موروثی طور پر منتقل ہوتا چلا آرہا ہے بیسیوں اقوال امام شافعی کے حوالہ سے ان شافعیوں میں مشہور ہیں جو ہر صاحب علم مقلد کو آزاد تنقید کا حق عطا کرتے ہیں کہتے ہیں کہ امام کی وصیت ہے۔ جس کے راوی ان کے تلمیذ رشید امام بویطی[1] ہیں کہتے ہیں۔

---

[1] ابو یعقوب یوسف بن یحییٰ المصری البویطی امام شافعی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں بڑے بڑے محدثین نے انہوں نے حدیث سنی ان کے حلقۂ درس میں ابوعیسیٰ الترمذی جیسے محدث بھی داخل ہیں، واثق باللہ کے زمانہ میں مصر سے بغداد آئے لائے "خلق قرآن" کے مسئلہ میں ان کو قید کر دیا۔ قیدخانہ میں (۴۰) رطل وزنی طوق اور بیڑیاں ان کے جسم پر تھیں۔ جب اذان ہوتی تو نماز جمعہ کے لئے تیار ہو کر نکلتے دروازہ جیل کا دربان روکتا تو وہ کہتے داعی اللہ (یعنی میں اللہ کی طرف بلانے والے کی آواز پر چل پڑا ہوں) پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے اور کہتے اے اللہ تو جانتا ہے میں نے تیرے پکارنے والے کے حکم کی تعمیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن انہوں نے مجھے روک دیا ہے۔ بویطی صالح تنہائی پسند عابد و زاہد تھے۔ رات کے ہر حصہ میں تلاوت قرآن اور نماز میں مصروف رہتے امام شافعی کو ان کے فتووں پر بڑا اعتماد تھا چنانچہ امام کے یہی جانشین ہوئے ۴ ماہ رجب ۲۳۱ھ ہجری میں بغداد کے قیدخانہ میں وفات پائی (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۴۷)

سمعت الشافعی یقول لقد الفت ھذہ الکتب
ولم آل فیھا ولا بدّ ان یوجد فیھا
الخطاء لان اللہ یقول لو کان من عند
غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرًا
فما وجدتم فی کتبی ھذہ مما یخالف
الکتاب والسنۃ فقد رجعت عنہ (توالی ص۶۳)

میں نے امام شافعی سے سنا فرماتے تھے ان کتابوں کی تالیف جو
میں نے کی ہے تو حق تک پہنچنے میں کوئی دقیقہ میں نے اٹھا
نہیں رکھا مگر پھر بھی ضرور ہے کہ ان میں غلطیاں رہ
گئی ہوں اسلئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن اگر خدا کے
سوا کسی اور کے خدید سے آتا تو یقیناً اس میں (تھوڑا ہی
نہیں) بلکہ بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا پس کتاب و سنت
کے خلاف جو بات تم پاؤ سمجھو کہ میں نے اس مسئلہ میں رجوع کیا ہے (مطلب یہ تھا کہ خدا کی کتاب کے سوا ہر انسانی کام میں
قلیل ہی نہیں بلکہ اختلاف کثیر کا پیدا ہو جانا ضرور ہے قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے)۔

یہ بھی فرماتے تھے کہ میری جو بات کتاب وسنت کے خلاف ہو تو

فانا راجع عنھا فی حیاتی وبعد مماتی — میں نے اس سے رجوع کر لیا ہے زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی

الغرض خود امام کے طرز عمل کا بھی اور اس قسم کے ان کے اقوال کا بھی ایک عام اثر شافعیہ میں ہمیشہ باقی رہا۔ گو بتدریج تقلید نے ان کو بھی قریب قریب اپنے اساتذہ اور ائمہ کے اقوال کے متعلق اسی نقطہ پر پہونچا دیا ہے جس پر دوسرے ائمہ کے مقلدین ہیں، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں میں تقلید کا رنگ جب کبھی اور جہاں کہیں اتنا گہرا ہونے لگا ہے کہ بجائے فائدہ کے اب نقصان کا پہلو غالب آرہا ہو تو یہ دیکھا گیا ہے کہ ان ہی لوگوں میں سے جو حضرت امام شافعی کے حلقہ اثر میں ہیں خدا کا کوئی نہ کوئی بندہ ردعمل پر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہی آواز جو دوسری صدی کے اختتام پر امام رحمہ اللہ علیہ نے اٹھائی تھی پھر بلند ہو جاتی ہے مسلمان چونک پڑتے ہیں اور جہاں سے دور ہو رہے تھے، پھر قریب ہو جاتے ہیں۔ خود ہندوستانی مسلمانوں میں پچھلے دنوں اپنے مذہب کی جانچ کا خیال پیدا ہوا اور وہ تحریک اٹھی جس کا نام "اہل حدیث" کی تحریک ہے تو اس کا آغاز بھی ان ہی لوگوں سے ہوا۔ جو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے متاثر تھے، اہل حدیث کی یہ تحریک بجائے خود کیا تھی؟ کیسی تھی؟ مجھے اس سے بحث نہیں، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ حنفی مسلمانوں میں "الکتاب والسنۃ" کے پڑھنے پڑھانے کا جو عام ذوق پیدا ہو گیا ہے اس میں بہت کچھ دخل اسی تحریک کو ہے۔ الغرض دور ہونے کے بعد پھر اپنے دین کے اصلی سرچشموں پر مسلمان پلٹ پلٹ کر

تیرہ سو سال کے اندر جو پھوپختے رہے ہیں اس کا اعتراف نہ کرنا سخت ناشکری ہوگی کہ اس کا اجر اول حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہی کو ملتا رہے گا۔ ان ہی کی نظر ثاقب تقلید کے اس بڑے اور خطرناک پہلو پر پہلی دفعہ پہنچی اور اپنی ساری زندگی، سارا علم، ساری صحت و عافیت، مسلمانوں کو کتاب وسنت سے قریب رکھنے پر انہوں نے قربان فرمادی فجزاہ اللہ عنا وعن امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خیر الجزاء کہنے والوں نے اگر یہ کہا ہے۔

لولا الشافعی لاندرس الاسلام (توالی ص۶۲) اگر شافعی رحمۃ اللہ علیہ نہ ہوتے تو اسلام ایک مٹ گیا ہوتا۔

تو شاید یہ مبالغہ نہیں ہے۔ اور یہی مطلب ہے امام فن رجال ابوزرعہ رازی کے اس قول کا۔

ما اعلم احداً اعظم منۃ علی اھل الاسلام من الشافعی (توالی ص۶۱) میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں پر احسان کرنے والوں میں امام شافعی سے زیادہ احسان کرنے والا اور کوئی ہے۔

امام محمد کی ان کتابوں کا خیال کیجیے جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہے اور اس کے بعد ان ہی کتابوں کے متعلق

فوضعت الی جنب کل مسئلۃ حدیثا (توالی ص۶۷) میں نے ہر مسئلہ کے پہلو میں ایک ایک حدیث لکھدی

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس دعوے کو پیش نظر رکھیے اب خواہ تائیداً یہ کام کیا گیا یا تردیداً غور کرنے کا مقام ہے کہ جس شخص نے نصوص سے مسائل کے استنباط کرنے کی اتنی مشق بہم پہنچائی ہوا اور صرف یہی نہیں کہ یہ کام تو صرف بغداد کا ہے۔ مصر پہنچنے کے بعد امام شافعی کی جن کتابوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

انہ وضع الکتب علی مالک (ص۶۸) امام شافعیؒ نے امام مالک کی کتابوں پر کئی تنقیدی کتابیں لکھیں

گویا امام مالک کے مسائل، مجتہدات کی تنقید کا انہوں نے الگ مستقل کام کیا، تو کون اندازہ کرسکتا ہے ان کی اس مشق اور مہارت کا جو اس تنقیدی مہم میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوئی قرآنی آیات اور پیغمبر کے اقوال و ملفوظات، افعال اور تقریرات کے کن کن پہلوؤں پر ان کی نظر پہنچی اور اس ذریعہ سے استنباط و اجتہاد کے کیسے کیسے اسرار و رموز ان پر واضح ہوئے یہ ایک ایسی بات ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ امام سے پہلے ائمہ مجتہدین نے جو اجتہادی و استنباطی کام کیا تھا اس کی نوعیت بھی یہی تھی یعنی وہ بھی غیر منصوص نوازل و حوادث کے لئے کتاب و سنت کے منصوصات اور صحابہ کے اقضیہ و فیصلوں ہی سے احکام پیدا کرتے تھے۔ یعنی ان کے فقہی مسائل کے لئے بھی آخری سرچشمہ وہی چیزیں تھیں جن میں غواصی کی مشق امام شافعی نے بہم پہنچائی تھی۔

لیکن ہمیں اس فرق کو تسلیم کرنا چاہیئے جسکی طرف شاہ ولی اللہ نے اشارہ فرماتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ امام شافعی سے پہلے مجتہدین و فقہاء ان نوازل و حوادث میں جن کے متعلق نصوص میں صراحۃً حکم نہیں ملتا تھا اگرچہ انہوں نے بھی

تاملوا فی عمومات الکتاب والسنۃ وایمآ ئہما واقتضا ئہما وحملوا بنظیر المسئلۃ علیہما فی الجواب اذا کانتا متقاربین بادی الرائ

کتاب و سنت ہی کے عمومات اور اسی کے اشارات و اقتضاآت ہی میں غور و خوض اور اسی کے استنباط احکام کا کام کیا تھا اور وہ سب بھی کسی غیر منصوص مسئلہ کا حکم اسکی منصوص نظیر ہی سے نکالتے تھے۔

لیکن

لا یعتمدون فی ذالک علی قواعد من الاصول ولکن علی ما یخلص الی الفھم ویثلج بہ الصدر (انصاف ص ۳۴)

یہ واقعہ ہے کہ ان کا یہ فقہی کام مرتب قسم کے قواعد و مدون اصول کے اساس پر نہ ہوتا تھا بلکہ جو کچھ اس راہ میں وہ سمجھتے تھے اور جس پر انکا قلب مطمئن ہو جاتا تھا وہی انکے فکر و فہم کا نتیجہ قرار پاتا تھا

گویا ٹھیک مثال اسکی ایسی ہے کہ ارسطو سے پہلے بھی علمی دنیا استدلال، برہان، تعریف، حجت، قیاس وغیرہ سارے منطقی قاعدوں کو اگرچہ اپنے علمی کاروبار میں استعمال کرتی اور برتتی تھی۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ منطقی قاعدے جو اب کتابوں میں ہیں ارسطو سے پہلے مدون و مرتب نہ تھے یہی حال امام شافعی سے پہلے مجتہدین کا بھی تھا کہ استنباط و اجتہاد میں جو کچھ کرنا پڑتا ہے سب کرتے تو وہ بھی تھے لیکن اس وقت تک استنباط و اجتہاد وغیرہ کے قواعد و ضوابط فنی شکل میں مرتب نہ تھے، بلکہ صحابہ کے زمانہ سے جو بات چلی آتی تھی بس وہی طریقہ ان حضرات کا بھی تھا جیسا کہ شاہ صاحب نے دوسرے موقع پر اسی کتاب میں لکھا ہے۔

فرأی کل صحابی ما یسرہ اللہ تعالیٰ

پس ہر صحابی نے جو کچھ اللہ نے ان کے لئے

فی عباداتہ وفتاواہ واقضیتہ وحفظھا وعقلھا وعرف لکل شیٔ وجھاً من قبل حفوف القرائن بہ فحمل بعضھا علی الاباحۃ وبعضھا علی الاستحباب وبعضھا علی النسخ لامارات وقرائن کانت کافیۃ عندہ ولم یکن العمدۃ عندھم الا الاطمینان والثلج بغیر التفات الی طرق الاستدلال (ص)

یسر کیا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عبادات آپکے فتووں اور فیصلوں کو انہوں نے دیکھا، اور جس قسم کے قرائن واسباب تھے ان کو پیش نظر رکھکر کسی ایک پہلو کے متعلق رائے قائم کی، مثلاً آنحضرت کی بعض باتوں کو تو جواز اور اباحت پر محمول کیا، بعض کو استحباب پر، بعض کے متعلق سمجھا کہ اب اس کا حکم منسوخ ہوگیا ہے، یعنی ایسے قرائن اور نشانیاں موجود تھیں جن سے یہی سمجھا جاسکتا تھا، اور یہی قرائن واسباب ان کی نگاہوں میں کافی تھے، بہر حال ان کو جو کچھ بھی تھا وہ صرف اسپر کہ دل کس پہلو پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اعتماد کی خنکی کس سے حاصل ہوتی ہے، استدلال کے جو خاص فنی طریقے ہیں۔ ان کی طرف ان کا دھیان بھی نہ جاتا تھا۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے لکھا ہے۔ کہ

کما تری الاعراب یفھمون مقصد الکلام فیما بینھم ویثلج صدورھم بالتصریح والتلویح والایماء من حیث لا یشعرون (ص)

یعنی جس طرح تم عام دیہاتیوں کو دیکھتے ہو کہ باہم آپس کی بات چیت میں ایک دوسرے کا مطلب بھی سمجھ لیتے ہیں، صاف صاف یا اشاروں کنایوں میں جو باتیں ہوتی ہیں اُن کے مقاصد تک اس طور پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے دل میں اس کا اطمینان رہتا ہے کہ بات کی تہ تک ہم پہنچ گئے، لیکن کیوں پہنچے؟ اسکا انھیں احساس بھی نہیں ہوتا۔ جہاں تک تاریخ کی شہادت ہے اس سے بھی شاہ صاحب کے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔

فن اصول فقہ کے قواعد وضوابط پہلے کس نے استعمال کئے۔

اس کے بعد اب ہمارے سامنے وہ سوال آتا ہے جس کے لئے مجھے اتنی تفصیلات کو پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے لفظوں میں اس سوال کو یوں کہیئے کہ اجتہاد واستنباط نے جو فنی قواعد وقوانین اور کلی ضابطے آج اصول فقہ کی کتابوں میں نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے اب "اصول فقہ" نے اسلامی علوم کے سلسلے میں ایک مستقل اور اہم فن کی شکل اختیار کرلی ہے اس کی ابتدا کس نے کی؟

"التشریع اسلامی" یا اسلامی قانون کے عصری مورخ علامہ محمد الخضری المصری" جنہوں نے فقہ کی تاریخ "التشریع الاسلامی" کے نام سے مرتب کی ہے جس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، یہ علامہ الخضری اپنی

اس کتاب میں لکھتے ہیں۔

بیروی فی تاریخ ابی یوسف ومحمد بن الحسن انهما کتبا فی تلك الاصول (التشریع الاسلامی ص۱۳۵ مطبوعہ مصر)

امام ابو یوسف اور امام محمد بن الحسن کی تاریخ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے فقہ کے اصول وقوانین کے بارے میں لکھا ہے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کی تدوین کا آغاز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ان ہی دونوں تلامذہ راشدین نے کیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جستہ جستہ تاریخ کی کتابوں میں ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے الخضری کے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے خود ایک شافعی مورخ قاضی ابن خلکان نے امام ابو یوسف کے متعلق لکھا ہے کہ

هو اول من وضع الکتب فی اصول الفقه علی مذهب ابی حنیفة (جلد دوم ص۳۰۳)

سب سے پہلے انہوں نے (یعنی قاضی ابو یوسف نے) امام ابو حنیفہ کی فقہ کے اصول پر کتاب لکھی۔

اسی طرح امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح میں جن واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصول فقہ کے مسائل جس فنی شکل وصورت میں آج کل کتابوں میں پائے جاتے ہیں وہ بھی انہیں استعمال کرتے تھے۔ مثلاً شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "انصاف" ہی میں امام محمد اور امام شافعی کے ایک مناظرے کا تذکرہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے۔

بلغنا انه دخل علی محمد بن الحسن وهو یطعن علی اهل المدینة فی قضائهم بالشاهد الواحد مع الیمین ویقول هذا زیادة فی کتاب الله فقال الشافعی أثبت عندك انه لایجوز الزیادة علی کتاب الله بخبر الواحد قال نعم (ص۲۰)

مجھ تک یہ بات پہونچی ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن امام محمد کے پاس پہونچے اس وقت امام محمد اہل مدینہ یعنی مالکیوں کی اس مسئلہ پر کہ قسم کے ساتھ ایک گواہ کے ذریعہ بھی قاضی فیصلہ کرسکتا ہے اعتراض کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ کتاب اللہ پر اضافہ ہے تب امام شافعی نے فرمایا کہ کیا آپ کے نزدیک یہ مسئلہ ثابت ہو چکا ہے کہ خبر واحد سے کتاب اللہ کے مضمون پر اضافہ ناجائز ہے؟ امام محمد نے کہا ہاں (یعنی میرے نزدیک یہی امر محقق ہے)

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ "خبر واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ ناجائز ہے" اصول فقہ کا فنی مسئلہ ہی نہیں بلکہ فن کی مخصوص تعبیر ہے اگر واقعی الفاظ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں کہ "ہذا زیادۃ فی کتاب اللہ" تو معلوم

ہوتا ہے کہ تحریر میں اصول فقہ کے ضوابط آئے ہوں یا نہ آئے ہوں لیکن مسائل کی فنی تعبیروں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس واقعہ کو حافظ ابن حجر نے تو آگے میں جس شکل میں نقل کیا ہے اسکے الفاظ اور ہیں۔ یعنی ہارون الرشید جس کے دربار میں یہ مناظرہ ہو رہا تھا اس کو مخاطب کر کے امام محمد نے فرمایا۔

یا امیر المومنین ان اھل المدینۃ خالفوا کتاب اللہ نصاً واحکام رسول اللہ واحکام المسلمین و قضوا بالشاھد والیمین (ص ۲)

اے امیر المومنین ان مدینہ والوں نے کتاب اللہ کے قطعی حکم کے خلاف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے احکام کے خلاف یہ مسئلہ بنایا ہے کہ قاضی ایک گواہ اور قسم کے ذریعے فیصلہ کرنیکا حق رکھتا ہے

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی روایت کو جسے حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجاز کے کسی شافعی استاذ سے سنا ہے۔ اور انھوں نے واقعہ کی تعبیر فنی الفاظ میں شاہ صاحب کے سامنے کی "بلغنا" (ہم تک یہ بات پہنچی ہے) کے لفظ سے بھی فی الجملہ اس کی تائید ہوتی ہے کہ شاہ صاحب نے اس واقعہ کو کسی کتاب سے نقل نہیں فرمایا ہے بلکہ یہ ان کی سنی ہوئی ایک بات ہے۔

بہر حال امام محمد اور امام ابو یوسف ان دونوں بزرگوں کی جو کتابیں اس وقت موجود ہیں ان کے دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ گو استنباط اور اجتہاد کے جو عام قاعدے ہیں ان کو بہ کثرت اپنی کتابوں میں یہ حضرات ضرور برتتے ہیں لیکن عام طریقہ ان کا وہی ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے لکھا ہے

لا یعتمدون فی ذالک علی قواعد من الاصول ولکن علی ما یخلص الے الفھم ویثلج بہ الصدر (انصاف ص)

وہ اصول کے قواعد مقررہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے لیکن بس اُن کا عام معیار یہ تھا کہ ذہن تک جو بات منتقل ہو جائے اور جس کے ذریعہ سے اطمینان کی ٹھنڈک دل کو حاصل ہو جائے

اور اصول فقہ کی جو کتابیں دنیا میں ہیں ان میں سے کسی کی بھی تصنیف ان بزرگوں کی طرف منسوب نہیں ہے۔

علامہ خضری راقم ہیں — ولکن مما یحزن انہ لم یصل الینا شیء من کتبھم[1] (ص ۱۳۵)

ظاہر ہے کہ فقہ اسلامی کا خضری جیسا مستند مؤرخ جب یہ لکھ رہا ہو تو اسکے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ان بزرگوں نے اس فن کے متعلق اگر کچھ لکھا بھی تھا تو اب دنیا سے وہ ناپید ہے۔

[1] لیکن یہ افسوسناک مقام ہے کہ ہم کو ان کتابوں میں سے کوئی کتاب نہیں ملی۔

اور میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی طرف "اصول فقہ" کی تدوین کو منسوب کیا ہے انھیں کچھ لفظی اشتباہ ہو گیا ہے، میرے نزدیک "مسائل اصول فقہ" سے ان مورخوں کی مراد وہ مسائل نہیں ہیں جنھیں ہم اب کتابوں میں پاتے ہیں بلکہ غالباً اس سے مقصد وہی ہے کہ فطری طور پر "الکتاب والسنۃ" سے عمومات و اقتضاءات سے وہ استدلال کرتے تھے اور نظیر کو نظیر پر محمول کرتے تھے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں انکی اسی طرز عمل کی تعبیر "اصول فقہ" کے الفاظ سے بعضوں نے کر دی ہے، بعد والوں کو جس سے غلط فہمی ہوئی ہے۔

اصول فقہ کی پہلی فنی کتاب میرے اس دعوے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بالاتفاق خلفاً عن سلف مورخین اور علماء اپنی کتابوں میں یہ لکھتے چلے آرہے ہیں کہ فن "اصول فقہ" میں سب سے پہلی کتاب امام شافعیؒ کا "الرسالۃ" ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:۔

لم یکن قواعد الجمع بین المختلفات منصوصا عندهم فیطرق بذالك خلل فی مجتهداتهم فوضع لها اصولا ودونها فی کتاب وهذا اول ما دون فی اصول الفقه (انصاف ص۲)	مختلف نصوص میں مطابقت کرنے کیلئے قاعدے ان لوگوں کے پاس موجود نہ تھے اسلئے انکے اجتہادی مسئلوں میں خلل واقع ہوتا تھا۔ تب امام شافعی نے اس کے قواعد بنائے اور ان کو ایک کتاب میں لکھا اور یہی اصول فقہ میں پہلی تصنیف ہے۔

جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوا کہ اصول فقہ کی تدوین کا کام سب سے پہلے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا ہے بلکہ یہ بھی کہ امام شافعی کی اس کتاب سے پہلے اس فن کے قواعد سرے سے منضبط نہیں تھے، الخضری نے بھی لکھا ہے کہ دنیا میں اصول فقہ کا جو موجودہ سرمایہ ہے اور علماء کی رسائی جہاں تک ہے اسمیں سب سے پہلی کتاب امام شافعی ہی کی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

اما الذی وصل الینا ویعتبر اساسا صحیحا فی هذا العلم وثروة کبری للباحثین فیه فهو "الرسالة" التی املاها محمد بن ادریس الشافعی الامام المکی ثم	فن اصول فقہ میں جو ایسی کتاب ہم تک پہنچی ہے جو اس علم میں بنیاد ہے اور اس فن میں بحث کرنے والوں کے لئے ایک زبردست میراث کی حیثیت رکھتی ہے وہ "الرسالۃ" ہے جسکو امام محمد بن ادریس الشافعی

المصری ، (تاریخ التشریع الاسلامی ص۱۳۵) الکی المصری نے لکھا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ مضبوط شہادت وہ ہے جو حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں نقل کی ہے یعنی یہ لکھکر کہ:۔

اول من صنف فیہ الامام الشافعی ذکرہ الاسنوی فی التمھید (ص۹۰)	سب سے پہلے اس فن میں امام شافعی نے "الرسالۃ" تصنیف کی ہے اسکو الاسنوی نے اپنی کتاب تمہید میں ذکر کیا ہے۔
یہ بھی لکھا ہے کہ:۔ حکی الاجماع فیہ ص۹۰	(الاسنوی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسی پر یعنی سب سے پہلی تصنیف اصول فقہ میں الرسالۃ ہے، اجماع قایم ہو چکا ہے)۔

جسکا یہی مطلب ہوا کہ فن اصول فقہ کی تدوین و تصنیف کے آغاز کا سہرا حضرت امام شافعی کے سر صرف بعض ہی لوگوں نے نہیں باندھا ہے بلکہ امت کا اسپر اجماع ہے اور جو مواد اسوقت تک ایک مختصر مقالہ کی حیثیت سے یہاں ابتک پیش کیا جا چکا ہے۔ یقینا اسکا بھی یہی اقتضا ہے۔

حضرت امام نے یہ کتاب کیوں لکھی

یہ طے ہو جانے کے بعد کہ امام ہی کا "الرسالۃ" فن اصول فقہ کی پہلی کتاب ہے، قدرتاً یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ امام نے یہ کتاب کیوں لکھی؟ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اپنے تنقیدی کاروبار میں امام کی نظر ان کلیات و ضوابط کی طرف قدرتاً جاتی ہوگی جنکی روشنی میں نصوص (الکتاب والسنۃ) وغیرہ سے وہ مسائل پیدا کرتے تھے، پھر جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ بہ نسبت دوسرے ائمہ فقہ و اجتہاد کے غالباً فقہ کے یہ پہلے امام ہیں جنکی نظر ماقبل الاسلام کی تصنیفات و تالیفات پر بھی پڑی تھی۔ بتایا جا چکا ہے کہ وہ بقراط الطبیب الیونانی کی کتابیں پڑھا سکتے تھے، علم نجوم میں بھی انکا پایہ بلند تھا لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ علم قیافہ کے ایک مستند عالم تھے، ظاہر ہے کہ ان علوم و فنون میں جو کتابیں تھیں انمیں ہر فن کے متعلق باضابطہ قواعد و اصول بنائے گئے تھے، کتابیں فصول و ابواب پر تقسیم ہوتی تھیں اسی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ اجتہاد و فقہ کے اصول و قواعد کو ایک باضابطہ فن کی شکل میں مدون کرنے میں جہاں دیگر

لہ یہاں سے بجنسہٖ حضرت الاستاذ مولانا مناظر احسن گیلانی کے املائی لکچر کے الفاظ دور تک نقل کئے گئے ہیں، عبدالرحمن

اسباب و وجوہ کو دخل ہو، ان ہی میں ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت امامؒ کے سامنے دوسرے مدونہ علوم و فنون کے نمونے تھے اسی لئے امام شافعی کے "الرسالۃ" کو صرف اصول فقہ ہی کی پہلی کتاب میں نہیں سمجھتا بلکہ مسلمانوں نے جو فنون ایجاد کئے انمیں یہ پہلا فن ہو اور اس فن کی پہلی کتاب یہ "الرسالۃ" ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ تفسیر و حدیث و فقہ جیسے علوم و فنون کی کتابیں بکثرت امام شافعی سے پہلے بھی لکھی جا چکی تھیں لیکن انمیں بس معلومات جمع کئے گئے تھے، مگر جسکا نام "فن" ہو یا ہمارے اسلاف کی قدیم اصطلاح کی بنا پر جسکو "صناعۃ" کہتے ہیں اس کے لحاظ سے تقدم و اولیت کا شرف یقیناً فن اصول فقہ اور اسکی اسی کتاب کو حاصل ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کا خیال حضرت امام کو خود ہوا یا کسی کی تحریک سے آپنے اسکو مرتب کیا۔ جہانتک میں سمجھتا ہوں امام نے اس کام کو کسی کی فرمایش ہی سے انجام دیا ہو اگرچہ خود اس کتاب میں کہیں اسکا ذکر نہیں ہو لیکن کتاب کا نام "الرسالۃ" جو رکھا گیا ہے میرے خیال میں یہ خود اسکی دلیل ہے کہ کسیکو لکھکر یہ کتاب بھیجی گئی ہو۔ "رسالے" کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو چیز دوسرے کو بھیجی جائے بلکہ میں تو یہ بھی خیال کرتا ہوں کہ چھوٹی اور مختصر تحریروں کو اس زمانے تک مسلمان "رسالہ" کہتے جو چلے آرہے ہیں اسکی وجہ بھی غالباً یہی ہو کہ امام نے اپنی اس کتاب کا نام "الرسالۃ" رکھا، واللہ اعلم بالصواب جس معنی میں آج رسالہ کے لفظ کو استعمال کیا جاتا ہے یعنی وہی مختصر چھوٹی کتاب ظاہر ہے کہ "رسالت" کے لغوی معنی سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہو، اس قرینہ کے سوا "الخطیب" نے اپنی تاریخ بغداد میں امام کے بغدادی شاگرد ابو ثور کے حوالے سے یہ روایتیں نقل کی ہیں۔

كتب عبد الرحمن بن مهدي¹ الى
الشافعي وهو شاب ان يضع له كتاباً
فيه معاني القرآن ويجمع فنون الاخبار
فيه وحجة الاجماع وبيان الناسخ و
المنسوخ من القرآن والسنة فوضع

عبد الرحمن بن مہدی نے امام شافعی کو لکھ بھیجا
جب امام شافعی عنفوان شباب ہی میں تم کہ وہ ایک کتاب
لکھیں جسمیں قرآن کے معانی و مطالب بیان کئے جائیں اور
جسمیں اخبار و احادیث کی اقسام حجت اجماع اور کتاب و
سنت کے ناسخ و منسوخ بھی بیان کئے جائیں اسکے بعد

¹ عبد الرحمن بن مہدی سنہ ۱۳۵ ہجری میں پیدا ہوئے شعبہ و سفیان وغیرہ محدثین سے علم الحدیث حاصل کیا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

له الرسالة (تاریخ بغداد للخطیب ج ۲ ص ۶۵)	امام شافعی نے کتاب "الرسالہ" لکھی۔

اور غالباً ابو ثور کے اس قول ہی کا وہ خلاصہ ہے جسے حافظ ابن حجرؒ نے توالی میں بایں الفاظ نقل کیا ہے۔

کتب عبد الرحمٰن بن مهدی الی الشافعی وهو شاب ان یضع له کتابا فوضع له کتاب الرسالة۔ (توالی ص ۵۵)	عبد الرحمٰن بن مہدی نے امام شافعیؒ کو جب وہ بالکل جوان تھے لکھ بھیجا کہ ایک کتاب تصنیف کریں چنانچہ امام نے کتاب "الرسالہ" تصنیف کی۔

عبد الرحمٰن بن مہدی نے یہ تحریک کیوں کی؟

یہ طے ہو جانے کے بعد کہ فن اصول فقہ کی پہلی کتاب حضرت امام کا یہی "الرسالہ" ہے اور عبد الرحمٰن بن مہدی کی فرمائش سے انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبد الرحمٰن بن مہدی کو کیوں خیال اس کا پیدا ہوا کہ امام شافعی سے یہ کتاب لکھوائیں خود کتاب کے دیباچہ میں جیسا کہ اب عام مصنفین کا دستور ہے کوئی چیز ہمیں اس سلسلہ میں نہیں ملتی اور اسکی امید بھی ہمیں نہ کرنی چاہیے کیونکہ تصنیف و تالیف کا وہ ابتدائی عہد تھا جسمیں اس قسم کی چیزوں کے ذکر کا طریقہ مروج نہ ہوا تھا، لیکن بعض تاریخی اشاروں سے اس سوال کے جواب کی طرف کچھ رہنمائی ضروری ہوتی ہے۔

یہ مسئلہ کہ عملی زندگی میں خبر آحاد پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس کے متعلق کسی موقع پر میں ذکر کر چکا ہوں کہ حضرت امام شافعیؒ نے اس سوال کے جواب میں بعض لطیف اور دلچسپ چیزیں پیش فرمائی تھیں جنکی بدولت بیچارے محدثین کی محنتوں کا ایک بڑا نتیجہ یعنی وہی آحاد خبر و نکا اور حدیثوں کا جو ذخیرہ ان کے پاس تھا، اور جو ابتک مختلف وساوس

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ان کے حلقۂ درس میں ابن المبارک (جو امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے مشہور ہیں) علی بن المدینی وغیرہ زبردست محدثین شامل ہیں، ذہبی نے امام احمد بن حنبل کے حوالے لکھا ہے "هو افقه من یحیی القطان واثبت من وکیع" ابن المتوکل کا قول ہے "کنا اذا اردنا ان ننظر الی الدین والدنیا ذهبنا الی دار عبد الرحمٰن بن مهدی (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۲) علم الحدیث و علم الفقہ میں کمال رکھتے تھے بڑے عابد و متقی تھے انکو خلق قرآن کے مسئلہ میں جہمیہ سے سخت اختلاف تھا۔ ذہبی ہی نے ابراہیم بن زیاد کے حوالہ سے انکا ایک قول نقل کیا ہے فرماتے ہیں "اگر مجھے کچھ اختیار ملجائے تو ہر اس شخص کو جو قرآن کو مخلوق کہتا ہے، گردن مار کر دجلہ میں ڈالدونگا۔ (جلد اول ص ۳۰۲)

اور شکوک کا بدرقہ بنا ہوا تھا خرخشوں سے باہر نکل گیا، امام نے ان خبروں پر اعتماد کرنے کے متعلق کچھ ایسے مستحکم اور دلکو لگنے والے وجوہ پیش کئے کہ مسلمانوں میں اچانک حدیث کے اس حصہ نے اہمیت حاصل کرلی غالباً حضرت امام کو طبقہ محدثین میں جو غیر معمولی حسن قبول حاصل ہوا ہے منجملہ اور وجوہ کے ایک بڑا سبب اسکا خبر آحاد پر اعتماد حاصل کرانے میں امام کو جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، یہ بھی تھا۔ حافظ ابن حجر نے عبدوس العطار کے حوالہ سے نقل کیا ہے وہ کہتے تھے ۔

سمعت علی بن المدینی[1] یقول للشافعی فی عرفتی ھذہ اکتب کتاب خبر الواحد الی عبد الرحمٰن بن مھدی فانہ یسر بذالك - (توالی ص۵۵)

میں نے علی بن المدینی سے سنا وہ امام شافعی کو اسی کمرہ میں (غالباً یہ عبدوس العطار کا کمرہ تھا) یہ کہہ رہے تھے کہ آپ خبر واحد کی کتاب عبد الرحمٰن بن مہدی کے پاس لکھ بھیجئے وہ اس کو دیکھکر بہت مسرور ہونگے ۔

کہنے والے علی بن المدینی امام بخاری کے استاذ اور کیسے استاذ ہیں کہ امام بخاری کا مشہور قول ان کے متعلق ہے ۔

ما استصغرت نفسی عند احد الا عند علی بن المدینی (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص۱۵)

میں نے علی بن المدینی کے سوا کسی کے سامنے اپنے آپ کو کمتر نہیں سمجھا ۔

اور جنکے متعلق امام شافعی کو باور کرایا جاتا ہے کہ وہ آپ کی کتاب کو دیکھکر مسرور ہونگے وہ عبد الرحمٰن بن مہدی الامام ہیں جنکی شان میں الہی علی بن المدینی جیسے امام نقد رجال کا قول تھا کہ ؛۔

لو حلفت بین الرکن والمقام لحلفت انی لم ار مثل عبد الرحمٰن (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص۳۰۳)

اگر میں (خانہ کعبہ میں) رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان قسم کھاؤں تو میں کہونگا کہ عبد الرحمٰن کے مثل میں نے کسی کو نہیں دیکھا ۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خبر الواحد کے مسئلہ میں حضرت امام کے پیش کردہ وجوہ نے خصوصیت

---

[1] ابو الحسن علی بن عبد اللہ المدینی ثم المصری ۱۶۱ھ ہجری میں پیدا ہوئے بڑے جید اساتذہ سے علم الحدیث حاصل کیا ان کے شاگردوں میں الذہلی، البخاری، ابو داؤد وغیرہ اکابر ائمہ محدثین شامل ہیں، الذہبی نے ابو حاتم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ (علی بن المدینی) حدیث اور اسکی علت سمجھنے میں سب سے بڑا درجہ رکھتے ہیں اور میں نے احمد بن حنبل جیسے محدث کو بھی انکا نام لیکر پکارتے نہ سنا بلکہ تعظیماً ہمیشہ کنیت ہی سے پکارتے، عبد الرحمٰن بن مہدی (جوان کے استاذ ہیں) انکا قول ہے کہ "حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سب سے زیادہ جانتے ہیں" یحییٰ القطان نے کہا "انا اتعلم من علی اکثر مما یتعلم منی" (تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۲ ص۱۵)

کیساتھ طبقہ محدثین پر کتنا انقلابی اثر پیدا کیا تھا، اب واللہ اعلم بالصواب علی بن المدینی کی فرمایش کی تعمیل حضرت امام نے کی یا نہیں، لیکن تاریخی بیانات سے جنکا ذکر پہلے گزر چکا ہے، یہی پتہ چلتا ہے کہ آپ نے امام عبد الرحمن بن مہدی کی فرمایش پر یہ کتاب لکھی تو اس سے بظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ امام شافعی جو عبد الرحمن بن مہدی سے عمر میں بہت چھوٹے تھے کسی غیر معمولی تاثر کے بغیر اس قسم کی فرمایش کی آخر کیا وجہ ہوئی، خود ابو ثور نے وھو شاب کے الفاظ سے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ عبد الرحمن بن مہدی کے مقابلہ میں وہ نوعمر تھے مگر ان کو جب امام میں علم کی وہ کیفیت محسوس ہوئی جو باوجود کمسن کے آدمی کو بزرگ بنا دیتی ہے تو انھوں نے خود چند عنوانوں کی فہرست بنا کر اس لئے بھیجی کہ وہ ان عنوانوں پر ایک مستقل کتاب تصنیف کر دیں، عبد الرحمن بن مہدی جیسے امام جلیل کی فرمایش امام شافعی کے لئے بہرحال واجب التعمیل تھی، انھوں نے انکی مرضی کے مطابق ان عنوانوں پر ایک کتاب لکھدی اور یہی کتاب "الرسالہ" کے نام سے فن اصول فقہ کی پہلی کتاب قرار پائی

الرسالہ کی تصنیف میں عبد الرحمن بن مہدی کی شرکت

ابو ثور کی اس روایت سے جہاں ہمیں اصول فقہ کی اس پہلی کتاب کی وجہ تصنیف کا پتہ چلتا ہے وہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عنوانوں کی تجویز کی حد تک اس "رسالہ" کی تصنیف میں عبد الرحمن بن مہدی کا بھی ہاتھ ہے، گویا ان عنوانوں کی حیثیت سوالات کی ہے اور امام شافعیؒ نے انہی سوالات کے جوابات دیئے ہیں، اگر السوال نصف العلم کا مشہور فقرہ صحیح ہے اور نہ صحیح ہونیکی کوئی وجہ نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ "الرسالۃ" کی تصنیف کا نصف حق عبد الرحمن بن مہدی الامام کے حصے میں بھی آتا ہے۔

"الرسالۃ" کو دیکھکر امام عبد الرحمن بن مہدی کی مسرت

کتابوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی نے "الرسالہ" کو لکھ کر جب عبد الرحمن بن مہدی کی خدمت میں پیش کیا تو جیسا کہ مشہور مورخ ابن عساکر کے حوالہ سے العسقلانی نے نقل کیا ہے، عبد الرحمن بن مہدی نے الرسالہ کے مطالعہ کے بعد کہا۔

لما نظرت الرسالۃ للشافعی اذھلتنی	جب میں نے شافعی کی کتاب الرسالہ کا مطالعہ کیا تو میں

لا نعنی دائمیت کلام رجل عاقل فصیح ناصح (توالی ص۵۵)	تو میں ششدر ہو کر رہ گیا میں نے اس کتاب کو پایا کہ یہ ایک عقلمند فرزانہ فصیح اور امت ملت کے ہی خوا کا کلام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عبدالرحمن بن مہدی کی یہ مختصر تقریظ یا الرسالہ پر انکا یہ ریویو بجائے خود انکی وقت نظر، مغز سخن تک رسائی اور اسکی صحیح تعبیر کی بہترین مثال ہو، کتاب کی معنوی خوبیوں کی طرف عاقل سے اور لفظی محاسن کی طرف فصیح سے اور مصنف کے دل میں اللہ کے دین اور رسول کی امت کی بہی خواہی کا جو جذبہ موجزن تھا اسکی طرف ناصح⁵ سے ایسے بلیغ اشارے کئے گئے ہیں کہ چاہنے والا چاہے تو انکی تشریح میں چند اوراق کو کام میں لاسکتا ہے۔

بہرحال اس روایت کے آخر میں یہ بھی ہو کہ عبدالرحمن بن مہدی نے فرمایا کہ اس رسالے کی تصنیف کی وجہ سے

فانی اکثر الدعاء لہٗ	میں امام شافعی کو بہت دعائیں دیتا ہوں۔

اور حافظ ابن حجر نے ایک روایت نقل کی ہے جسمیں ہو کہ اس "الرسالہ" کا ذکر کرکے عبدالرحمن بن مہدی فرمایا کرتے

ما اصلی صلاۃ الا و انا ادعو للشافعی (توالی ص۵۵)	میں کوئی نماز نہیں پڑھتا جسکے بعد امام شافعی کیلئے دعا نہ کرتا ہوں۔

"الرسالۃ" یا اصول فقہ کی پہلی کتاب پر ایک اجمالی نظر	ظاہر ہو کہ اس مختصر مقالہ میں اسکی گنجائش تو کیسے پیدا ہوسکتی ہے کہ اس کتاب کے سارے مضامین پر کوئی تفصیلی تبصرہ کیا جائے لیکن

اس خصوصیت کی وجہ سے کہ جس عنوان پر میں یہ مقالہ پیش کر رہا ہوں اسکی یہ پہلی کتاب ہو، نیز بقول علامہ الخضری المصری کے

ان ھذہ الرسالۃ تراث کریم من ذالک العھد القدیم (التشریع الاسلامی ص۱۳۹)	یہ کتاب "الرسالہ" اس عہد قدیم کا ایک قیمتی ترکہ ہو۔

تو مسلمانوں کی ایک قدیم تاریخی یادگار ہونیکی حیثیت سے بھی یہ اس کی مستحق ہے کہ اس کی بعض خصوصیات کا بیان ذکر کیا جائے۔

⁵ "ناصح" "نصیحت" سے ماخوذ ہو۔ اردو میں نصیحت کا لفظ عموماً وعظ و پند کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ عربی زبان کا یہ عجیب ذریعہ (از اقا مقرر)

(۱) سب سے پہلی خصوصیت اسکی اسکا خاص طرز بیان ہے جو اسے تمام دوسری فنی کتابوں سے ممتاز کرتی ہے، مثلاً دیباچہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی کا تذکرہ فرماتے ہوئے امام نے ایک عجیب اسلوب اختیار فرمایا ہے۔

اسکا ذکر کرنے کے بعد کہ دین و دنیا کی جیسی یا کملی نعمتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے تصدق میں ہم سلمانوں کو میسر آئیں، اور اس طرح آیندہ زندگی کے مصائب سے بھی نجات حاصل ہوئی فرماتے ہیں۔

الا ومحمد صلوات اللہ علیہ ھو القائد الی خیر ھاد والحادی الی ارشد ھا النائی عن الھلکۃ وموارد السوٰ فی خلاف الرشد المنبھۃ للاسباب التی تورد الھلکۃ القائم بالنصیحۃ فی الارشاد والانذار فیھا (الرسالۃ ص)

ہاں ہاں! محمد (اللہ کی رحمتیں نازل ہوں ان پر) انسانی زندگی کے بہترین پہلو کیطرف وہی راہنمائی فرمانے والے ہیں راستوں میں جو صحیح ترین راہ ہے اسی کی ہدایت کرنیوالے ہیں، تباہی اور بربادی اور برائیوں کے مقامات سے آپ ہی ہٹانیوالے ہیں، جو باتیں ہلاکت کے اسباب بن جاتی ہیں ان پر آپ ہی نے تنبیہ فرمائی، راہ بتائی، اور دھمکانے ڈرانے میں آپ ہی کی ذات مبارک ہی جو صرف اخلاص پر قائم ہی

اسلوب بیان کی ندرت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اسی اقتباس پر کفایت کرتے ہوئے صرف اتنا اور عرض کرکے میں دوسری خصوصیتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ اس لحاظ سے پوری کتاب ہی قابل دید ہے، بلکہ غالباً میرا یہ خیال غلط نہ ہو کہ ہم لوگ جو عام کتابوں کے پڑھانے کے عادی ہیں ان کے لئے امام کی عبارتوں سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے کافی غور و خوض اور صبر و استقلال کی ضرورت ہی کہ اس کے الفاظ اسکی ترکیبیں اسکا طریقہ بیان سب ہی نرالے ہیں، اس سے اس زمانے کے طریقہ گفتگو اور اظہار ما فی الضمیر کے اسالیب کا بھی ایک تاریخی سراغ ملتا ہے۔

(حاشیہ گذشتہ صفحہ) جامع لفظ ہے۔ جو ہمدردی، اخلاص بہی خواہی کے مفہوم کو ادا کرتا ہے حدیث میں ہی کہ "الدین النصیحۃ" دین صرف بہی خواہی کا نام ہے۔ رسول اللہؐ سے پوچھا گیا کس کی بہی خواہی تو فرمایا اللہ اسکا رسول اور ان کے دین کی، اور مسلمانوں کے ائمہ یعنی حکومت کی بہی خواہی (بس اسی کا نام الدین ہے)

(۲) مضامین کے لحاظ سے جیسا کہ میں نے عرض کیا قریب قریب اس کتاب میں ان ہی عنوانوں سے بحث کی گئی ہے۔ جن پر امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں اجمال اور اشارہ سے کام لیا گیا تھا تفصیلی طور پر اس کتاب کے مباحث اِن دس عنوانوں پر تقسیم ہو سکتے ہیں:۔

(۱) قرآن اور اُس کا طریقہ بیان وطرز ادا (۲) السنۃ اور قرآن سے اس کا تعلق قرآن کے مقابلہ میں اُس کی حیثیت اور اس کا مقام (۳) ناسخ ومنسوخ کی بحث (۴) حدیثوں کے علل یا وہ اسباب و وجوہ جن سے ان میں کمزوری پیدا ہوتی ہو (۵) خبر واحد پر اعتماد کرنے میں اس کا مقام (۶) اجماع اور اُس کا حکم (۷) قیاس (۸) اجتہاد (۹) استحسان یعنی کسی شرعی دلیل کے بغیر دین میں ایسے امور کا داخل کرنا جو عقلاً کسی کے نزدیک مبنی بر مصلحت معلوم ہوتے ہوں (۱۰) اختلاف اور اُس کی حقیقت، جائز وناجائز اختلافات کے حدود۔

یہ ہیں فن اصول فقہ کے وہ مباحث جنھیں پہلی دفعہ حضرت امام ؒ نے کتابی شکل عطا کی اِن عنوانوں کے ذیل میں پھر اُس کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، مثلاً عنوان اوّل یعنی قرآن اور اُس کے طریقہ بیان کے ذیل میں امام نے عام و خاص اور اس کے متعلقہ اساسی مباحث کا تذکرہ کیا ہے۔ گویا اس وقت جن اصطلاحی الفاظ کو ہم اصول فقہ کی کتابوں میں پاتے ہیں تقریباً اِن اصطلاحات کا ایک بڑا حصہ خود امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بنایا ہوا ہے، اور اب تک اِن ہی الفاظ کے ساتھ کتابوں میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

میرا تو خیال ہے کہ اس کتاب میں غور کرنے والے اگر غور کریں گے تو بارہ صدیوں میں باایں ہمہ طول وعرض فن اصول فقہ نے ارتقاء کی جتنی منزلیں طے کی ہیں اصولی حیثیت سے تقریباً اکثر چیزوں کو وہ اسی کتاب سے نکال سکتے ہیں۔ امام شافعیؒ کے مشہور شاگرد المزنی کے حوالے سے حافظ ابن حجر نے یہ فقرہ نقل کیا ہے وہ کہتے تھے:۔

قرأت کتاب الرسالة للشافعی خمس مائة مرة ما من مرة منها الا واستفدت	میں نے امام شافعی کی کتاب الرسالۃ پانچ سو دفعہ پڑھا ہے اور ہر دفعہ کوئی نہ کوئی نیا فائدہ حاصل کیا ہے۔

فلمْلَکَ جدیدۃ لم استفدھا فی الاول (زوائی)   جو پہلی دفعہ حاصل نہ کیا تھا

یان پانسو مرتبہ ایک کتاب کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ہر مطالعہ میں مطالعہ کرنے والے کو ایک نئی دولت' نیا خزانہ ہاتھ آتا ہے اور وہ بھی امام شافعی کے براہ راست اُس شاگرد (امام مزنی) کو جو اپنے وقت کا خود امام تھا، پس اس سے اس کتاب کی گہرائیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ان ہی المزنی سے یہ روایت بھی نقل کی ہے:-

انا انظر فی کتاب "الرسالۃ" عن الشافعی منذ خمسین سنۃ ما اعلم انی نظرت فیہ مرۃ الا وانا استفید شیئا لم اکن عرفتہ - (صٹ)

میں امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) کی کتاب "الرسالۃ" کو پچاس سال سے پڑھ رہا ہوں اور حال یہ ہے کہ جب کبھی میں اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں تو میں کسی نہ کسی ایسی چیز کا استفادہ ضرور کرتا ہوں جس کو پہلے میں سمجھ نہ سکا تھا۔

اس کتاب کے مباحث کا یہ تو ایک سرسری اجمالی تذکرہ تھا جیسا کہ میں نے عرض کیا اس سے زیادہ کی ہمارے مقالہ میں گنجایش بھی نہیں - البتہ بعض خاص باتیں اس کتاب کی ایسی ہیں جن کا ذکر نہ کرنا غالباً مناسب نہ ہوگا - مثلاً امام نے یہ طے کرنے کے بعد کہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور خدا نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کر کے اس کی دعوت کو سارے جہان کے لئے بنانے کی صورت یہ مقرر فرمائی ہے کہ:-

بعث بلسان قومہ خاصۃ دون السنۃ العجم یکون علی الناس کافۃ ان یتعلموا لسانہ ما اطاقوا منہ (صٹ)

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ان کی قوم (یعنی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے اُس قوم) کی زبان میں اتارا ہے نہ کہ عجم (غیر عرب) کی زبان میں اس لئے لوگوں پر اس زبان عربی کا سیکھنا فرض ہوگیا ہے جتنا کہ جہاں تک ان کے امکان میں ہو۔

اور ظاہر ہے کہ عربی زبان بھی انسانوں ہی کی زبان ہے' ایک انسان دوسرے انسان کی زبان عموماً سیکھ ہی لیتا ہے اس لئے یہ ایسی تکلیف نہیں ہے جسے "تکلیف مالا یطاق" قرار دیا جائے بہرحال مجھے اس سلسلہ میں حضرت امام کے اس خاص مسلک کا ذکر کرنا مقصود ہے جو عربی زبان کے سیکھنے کے متعلق آپ نے اختیار فرمایا ہے (امام فرماتے ہیں:-

علی کل مسلم ان یتعلم من لسان العرب   ہر مسلمان پر فرض ہے کہ عرب کی زبان کو اس حد تک سیکھنے کی

مابلغ جهده حتی یشهد به ان لا الٰه الا	کوشش کرے جہاں تک اس کے بس میں ہو اور اس کی کوشش
الله وان محمداً عبده ورسوله ویتلوه	پہنچ سکتی ہو تاکہ وہ اس بات کی گواہی ادا کر سکے
کتاب الله وینطق بالذکر فی ما فرض	جسے لا الٰہ الا اللہ کے کلمہ میں بیان کیا گیا ہے اور اللہ کی
علیه من التکبیر وامر به من التسبیح	کتاب پڑھ سکے اور ان الفاظ کو بول سکے جن کا بولنا اس کے
والتشهد وغیر ذالك فما ازداد من	ذمہ فرض ہے یعنی تکبیر اور جن تسبیحوں کا حکم دیا گیا اور تشہد اور اس کے
العلم باللسان الذی جعله الله لسان نبیه	سوا دوسری چیزیں اور جو اپنی کوشش و جد وجہد کو اس
ختم به نبوته وانزل به آخر کتبه کان خیراً	زبان کے سیکھنے میں بڑھائیگا جو اللہ کے اس نبی کی زبان
له کما علیه ان یتعلم الصلاة والذکر فیها	ہے جس پر نبوت ختم ہوئی اور جس پر خدا کی آخری کتاب

نازل ہوئی تو یہ اس کے لئے بہتر ہے بہر حال عربی سیکھنا اسی پر اسی طرح فرض ہے جیسے نماز، و نماز میں جو باتیں پڑھی جاتی ہیں ان کا سیکھنا

واقعہ یہ ہے کہ آیت قرآنی۔

لا تقربوا الصلوٰة وانتم سکاریٰ حتی	تم نماز کے پاس بھی نہ جاؤ ایسی حالت میں کہ تم
تعلموا ما تقولون۔ (النساء ع ۷)	سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو۔

پر اگر غور کیا جائے اور یہ سوچا جائے کہ "علم بما تقولون" "سمع بالمنطوق" "والملفوظ" نہیں ہے تو یہ چیز قابل غور ہو جاتی ہے کہ عربی جانے بغیر نماز کے قریب جانے کی آدمی کو اجازت بھی ہے یا نہیں[1]۔ خیر یہ تو اس کتاب کی علمی خصوصیتیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی اپنے اندر گوناگوں امتیازات سے یہ کتاب لبریز ہے الخضری نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

من احسن ما رأیته فی کتاب الشافعی	امام شافعی کے طرز تحریر کی ایک خصوصیت یہ بھی نظر

[1] آپ جو کچھ بول رہے ہیں میں اسے "سمجھ رہا ہوں" یا "جان رہا ہوں"۔ کیا یہ کہنا اس شخص کے لیے درست ہو سکتا ہے جو بولنے والے کی زبان تو نہیں سمجھتا لیکن منہ سے نکلنے والے الفاظ کو صرف سن رہا ہے اور الفاظ منطوقہ کے صرف سننے ہی کا نام یہ رکھتا ہے کہ جو کچھ تم بول رہے ہو اسے وہ جان رہا ہے؟ مسلمانوں کے لئے یہ مسئلہ قابل غور ہے (دیکھئے تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی) دراصل حضرت استاذی کے افادات میں سے یہ ایک افادہ ہے مدت ہوئی اس پر آپ کا ایک مختصر سا مضمون اخبار "سچ" وغیرہ میں چھپا تھا آخر میں آپ ہی نے جواب دیا تھا کہ سجدہ میں جیسے مطلوب تو یہ تھا کہ سجدہ والے کامل سجدہ ہو جس میں اطمینان ہو، ساتوں ہڈیوں پر سجدہ ادا ہو لیکن اگر حدیث کی تمثیل کے مطابق "نقر الدیک" (یعنی مرغ کے ٹھونگے مارنے کی طرح) سجدہ کر کے کوئی نماز سے فارغ ہو جائے تو قانونی طور پر نماز کے مطالبہ سے سبکدوش ہو جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا نے جس سجدہ کا مطالبہ کیا ہے وہ یہی "نقر الدیک" والا سجدہ ہے۔ اسی طرح مطلوب تو نماز میں یہی ہے کہ جو پڑھا جائے اسے پڑھنے والے سمجھیں بھی

رحمة الله عليه انه يحكى اقوال من
يناظرهم قائمة الحجة واضحة البرهان
يفصل كل ما يمكن ان لا يكون لهم من
قوة ثم يكر على ادلتهم ويدل على
ذالك مما كتبه فى الاحتجاج بالسنة لـه
مخصوصة (التشريع الاسلامى ص۱۳۹)

آتی ہے کہ وہ اپنے فریق مخالف جن سے مناظرہ
ہو رہا ہو اس کے کلام کو دلائل اور وجوہ کے ساتھ
نقل کرتے ہیں مخالف کی دلیل کو جس حد تک
مکمل اور واضح کر کے بیان کیا جا سکتا ہے اس میں کوتاہی
نہیں کرتے بلکہ جتنی قوت مخالف خرچ کر سکتا ہے اس کو
کام میں لاتے ہیں اس کے بعد پھر اس پر حملہ کرتے
ہیں اور اس سے زیادہ بہتر دلیل جیسی وہ سنت سے احتجاج کرنے میں قائم کرتے ہیں مشکل ہی سے کوئی قائم کر سکتا ہے،

الخضری نے اس پر بھی تنبیہ کی ہے کہ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی یہ کتاب

ینبئ عن کثیر من خلال القوم
فی ذالک العہد (ص۱۳۹)

اس زمانہ میں مسلمانوں کے عادات و اطوار
کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتی ہے

اور یہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کی تحریر و تقریر کا کیا طریقہ تھا؟ اپنے مخالفوں سے گفتگو کرنے میں لوگ کس آداب کے پابند تھے؟ فریق مقابل کا احترام کس حد تک ہر فریق اپنا فریضہ قرار دیتا تھا؟ استدلال و احتجاج کے وقت قرآن و حدیث کے استعمال کرنے کی کیا نوعیت تھی؟ دماغوں میں یہ چیزیں کس طرح حاضر رہتی تھیں؟ اس کتاب میں ان میں سے ہر چیز پر روشنی ڈالی گئی ہے اصول فقہ کی اس پہلی کتاب کے متعلق حسب گنجایش جو کہا جا سکتا تھا وہ کہا جا چکا، البتہ ایک تاریخی مسئلہ اس سلسلہ میں قابل بحث اور رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کتاب "الام" کے سوا البیہقی نے امام شافعی کی تصنیفات کی جو یہ فہرست دی ہے یعنی (۱) الرسالة القديمة (۲) الجديدة (۳) اختلاف الحديث (۴) اجماع اهل العلم (۵) ابطال الاستحسان (۶) احكام القرآن (۷) بيان الفرض (۸) صفة الامر والنهى (۹) اختلاف مالك والشافعى (۱۰) اختلاف العراقيين (۱۱) اختلافه مع محمد بن حسن (۱۲) كتاب على وعبد الله (۱۳) فضائل قريش۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو الفاظ بھی اُن کے کان سنتے ہیں اور ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے جدا جدا تمیز کرتے ہیں تو نماز ہو جاتی ہے کہ "علم بما تقولون" کی بہرحال ایک ناقص شکل یہ بھی ہو سکتی ہے جیسے "نفس الدیک" والا سجدہ بھی بہرحال "فاسجدوا" کے نیچے داخل ہی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اسقاط ذمہ کے لئے کافی ہے عبدالرحمٰن۔

ان میں "الرسالة" جیساکہ آپ دیکھ رہے ہیں بقول البیہقی اس کے دو نسخے ہیں ایک کا نام "الرسالة القدیمه اور دوسرے کا الرسالة الجدیده" ہے ایک دوسری روایت حافظ ابن حجر نے الحاکم کے حوالہ سے جو نقل کی ہے اس میں ہے کہ ایک صاحب فوراآن نامی کہتے تھے کہ امام احمد بن حنبل کی کتابیں ہم نے ان کے دونوں بیٹوں صالح اور عبداللہ سے سنیں۔

فوجدت فیھا رسالة الشافعی القدیمة — تو ان ہی کتابوں میں امام شافعیؒ کا رسالہ قدیمہ

والجدیدة العراقیه والمصریه (توالی) — جدیدہ بھی تھا یعنی العراقیہ اور المصریہ۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام نے اپنے اس رسالہ کو دو دفعہ لکھا ہے عبدالرحمٰن بن مہدی کے حکم اور مشورے سے جو رسالہ لکھا ہے وہی غالباً العراقیہ کے نام سے مشہور ہوا، اس لیے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی کا انتقال مصر جانے سے پہلے ماہ جمادی الاخری ۱۹۸ھ میں ہو چکا تھا۔ اس کے بعد جب امام شافعی مصر پہنچتے ہیں اور جیساکہ گذر چکا مصر پہنچکر ان کے بہت خیالات میں انقلاب پیدا ہوا اور ان کے متعلق رائے بدلنی پڑی غالباً یہی صورت "الرسالہ" کے مضامین میں بھی پیش آئی ہے یعنی مصر میں اس الرسالہ پر امام نے نظر ثانی فرمائی لیکن لوگوں میں دونوں نسخے مروج ہو گئے۔

بہرحال مذکورہ بالا شہادتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس "الرسالة" یا اصول فقہ کی اس پہلی کتاب کے دو مختلف نسخے ہیں اور دونوں میں مضامین کے لحاظ سے بھی اختلاف ہے مجھے اس کا صحیح طور پر پتہ نہ چل سکا کہ مصر سے متعدد بار "الرسالہ" جو چھپ چھپکر شائع ہوا ہے یہ کونسا نسخہ ہے عراقیہ یعنی قدیمہ ہے یا مصریہ یعنی جدیدہ، یہ ایک اہم مسئلہ ہے ضرورت ہے کہ اس کی تحقیق کی جائے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود امام کی یہ کتاب چاہتی ہے کہ کسی مستقل تصنیف کے ذریعہ سے اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔

اصول فقہ میں امام شافعی کی اس پہلی کتاب "الرسالہ" کے بعد اس فن میں تقریباً ہر قرن اور ہر صدی کے علماء نے مختلف حیثیتوں سے کتابیں لکھیں اور اس کا سلسلہ ابتک جاری ہے، بلکہ قیامت تک انشاءاللہ تعالیٰ جاری رہیگا، لیکن یہ سوال کہ امام شافعی کے بعد پھر اس فن میں پہلی کتاب کس نے لکھی۔ افسوس ہے کہ باوجود تلاش کے اب تک اس کا کوئی معین جواب مجھے نہیں مل سکا ہے جس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ تاتاری فتنہ نے اسلامی ادبیات

کے قدیم ذخیروں کو زیادہ تر برباد کر دیا، ماسوا اس کے لوگوں کا عام قاعدہ ہے کہ پچھلی تصنیفات گذشتہ تصنیفوں کے مضامین پر عموماً چونکہ مشتمل ہوتی ہیں اس لئے عام توجہ متاخرین ہی کی کتابوں پر مبذول ہو جاتی ہے، اس مذاق نے بیچارے متقدمین کے اکثر کارناموں کو گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا ہے، یہ تو کچھ امام شافعی ہی کی کرامت ہے کہ ان کا "رسالہ" حوادث روزگار سے بچتا بچاتا ہم تک پہنچ گیا ہے۔

بہرحال صحیح طور پر سردست یہ بتانا مشکل ہے کہ "الرسالہ" کے بعد اصول فقہ کی دوسری کتاب کون سی لکھی گئی تاہم ایک کلی بات کا سراغ ملتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جو مسلک اور طریقۂ عمل اختیار فرمایا تھا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایک طرف اس کی وجہ سے محدثین میں بیداری اگر موافقانہ حیثیت سے پیدا ہوئی تو دوسری طرف جن جن لوگوں پر ان کے قائم کردہ اصولوں سے زد پڑتی تھی ظاہر ہے کہ مخالفانہ ہل چل اگر ان طبقوں میں پیدا ہوئی تو محل تعجب نہیں ہے۔ پھر مخالفوں کے ان طبقات میں ایک طبقہ تو اہل السنت والجماعت ہی کا تھا۔ مثلاً امام ابوحنیفہؒ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے متبعین کا اور دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جنھیں اہل السنت والجماعت سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ جس زمانہ کی ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ ثانی الذکر طبقہ میں سب سے سربرآوردہ جماعت ارباب اعتزال کی تھی جن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مذہبی حقائق اور دینی امور میں وحی اور نبوت کے ساتھ ساتھ انھوں نے عقل کے استقلال کو بھی باقی رکھا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ مذہبی زندگی کی تنظیم میں وہ عقلی معلومات کو بھی شریک کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان میں کے بعض لوگ آیت قرآنی۔

ما کنا معذبین حتی نبعث رسولا — ہم عذاب دینے والے نہیں یہاں تک کہ بھیج دیتے ہیں پہلے رسول

کی تفسیر میں "رسول" کے لفظ کو پیغمبر اور عقل دونوں پر حاوی قرار دیتے تھے گویا پیغمبر کے ساتھ ساتھ عقل بھی ان کے نزدیک ایک رسالت کا کام انجام دیتی ہے "حسن وقبح عقلی" کے مشہور نظریہ کی بنیاد ان کے اسی زعم پر قائم ہے بلکہ ایک حد تک بعض مواقع پر عقل کی رسالت کو پیغمبر کی رسالت پر بھی گویا (العیاذ باللہ) یہ ترجیح دینے میں نہیں چوکتے تھے۔ خبر واحد

پر عدم اعتماد کا جو قول ان سے نقل کیا جاتا ہے اس کی وجہ بھی ان کی وہی بے اعتنائی ہے جو عقل کے مقابلہ میں اِن چیزوں سے قدرتاً ان میں پیدا ہوگئی تھی اور ہونی چاہئے تھی۔

تو جیسا کہ میں نے کہا امام شافعی کے خلاف بل چل یوں تو مختلف دائروں میں برپا تھی لیکن ان کی عام کتابیں خصوصاً "الرسالہ" کے مضامین سے جس فرقہ میں زیادہ بیچینی پیدا ہو سکتی تھی وہ معتزلہ ہی کا فرقہ تھا، جس استحسان کا رد امام نے پوری قوت سے اپنی اس کتاب میں فرمایا ہے اس سے در اصل اِسی عقلی شرک کا رد مقصود ہے جس کے معتزلہ مرتکب تھے، نیز خبر واحد کی اہمیت پیدا ہو جانے سے محدثین کی قسمت اگر جاگ اٹھی تھی تو معتزلہ کے بیسیوں مزعومات کی بنیاد ہی اس سے کھوکھلی ہوئی جاتی تھی۔

بہت سے ایسے مسائل جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ قرآن میں ان کا ذکر نہیں ہے بلکہ صرف السنۃ (حدیثوں) ہی سے ان کا ثبوت ملتا ہے جیسے عذاب[1] قبر اور کبائر کی معافی کا مسئلہ، جن کی بنیاد بخیال عام احادیث ہی پر مبنی سمجھی جاتی ہے اور معتزلہ کو جن سے انکار ہے۔ تو امام شافعی کے دلائل اور احادیث کی استنادی و احتجاجی حیثیت کے متعلق اون کی کتاب "الرسالہ" کے اصولی مباحث نے سچ یہ ہے کہ بحث کی بساط ہی اُلٹ کے رکھدی تھی اور مخالف خیال کو ایسا لچر و پوچ ثابت کر دیا تھا کہ گویا وہ ایک خالص جاہلانہ یا ایک طرح کا غیر اسلامی نظریہ ہے۔ غرض اس چیز نے حضرت امام کے خلاف معتزلہ میں ایک خاص جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ پھر اسی کے ساتھ جب ہم اس پر بھی غور کرتے ہیں کہ معتزلہ جن کی قوت سچ پوچھئے تو امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ کے بعد ٹوٹی ورنہ جیسا کہ

---

[1] لیکن درحقیقت عذاب قبر کا مسئلہ ہو یا کبائر کی مغفرت کا دونوں کا ثبوت قرآن سے ہو جاتا ہے ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء اور بخش دیگا اللہ شرک سے نیچے کے سارے گناہ جس کے واسطے چاہیگا۔ سے زیادہ صریح نص مغفرت کبائر میں اور کیا درکار ہے۔ اسی طرح مرکر دوسرے عالم میں پہونچنے کے ساتھ ہی آدمی راحت یا اذیت محسوس کرتا ہے قرآن کی متعدد آیتوں میں یہ مسئلہ موجود ہے۔ از انجملہ سورہ عم یتساءلون کی وہ آخری آیت انا انذرناکم عذابا قریبا یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ الا یۃ (ہم نے ڈرایا تم کو قریب کے عذاب سے جس دن دیکھے گا آدمی جو کچھ اس نے آگے بھیجا) سو اس کے لفظ "قریب" سے حضرت الاستاذ کا استدلال ہے کہ جہنم کے بعید عذاب کے سوا یہ کوئی

صاحب "مفتاح السعادت" نے لکھا ہے کہ :-

كان علم الكلام بايدى المعتزلة مائتى سنة مابين المائة والثلاث مائة (ص۳۷) | علم الکلام معتزلیوں کے ہی ہاتھوں میں سنہ ۱۰۰ھ سے سنہ ۳۰۰ھ تک پورے دو سو سال تک رہا۔

جس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلی صدی ہجری جس میں بکثرت غیر اقوام کے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور موروثی عقائد و خیالات کے جراثیم اپنے ساتھ لائے پھر شعوری یا غیر شعوری طور پر انھوں نے اسلام میں ان کو شریک کر دیا۔ جس میں سب سے زیادہ حصہ قبطی نومسلم غیلانی دمشقی کا ہے صاحب "مفتاح السعادۃ" ہی لکھتے ہیں :-

كان غيلان قبطيًا قدريا لم يتكلم احد فى القدر قبله (ج ۲ ص ۳۵) | غیلان قبطی النسل قدری تھا، اس سے پہلے کسی نے قدر کے بارے میں بحث نہیں کی۔

اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ :-

اخذ الغيلان هشام بن عبد الملك فصلبه بباب دمشق يقال ان ذالك بدعوة عمر بن عبد العزيز (ص ۳۵) | ہشام بن عبد الملک نے غیلان کو گرفتار کر دیا۔ اور دمشق کے دروازے پر سولی دی کہا جاتا ہے کہ عمر بن عبد العزیز کے ایماء سے یہ عمل ہوا۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ پہلی صدی ہجری ہی میں اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ نومسلموں کا جو سیلاب اسلام میں آگیا اور جو اپنے ساتھ پرانے جاہلی افکار و نظریات کا ایک عظیم الشان اور بڑے بڑے فتنوں کا سامان بھی لایا اس نے اسلام میں بہت سے طرح طرح کے فرقے بھی پیدا کئے انہی فرقوں میں سے ایک یہ معتزلہ کا فرقہ بھی تھا جس کو بعض خاص اسباب سے بڑی قبولیت اور طاقت حاصل ہو گئی تھی اور اس اپنی طاقت سے نفع اٹھا کر انھوں نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ پر معتصم عباسی خلیفہ کے ذریعہ وہ زہرہ گداز مظالم کرائے جن کی نظیر تاریخ میں موجود نہیں ہے اور ان کا یہ زور تیسری صدی تک قائم رہا۔
(باقی)

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اور قبر بھی عذاب ہے اور وہ عذاب قبر بھی ہو سکتا ہے۔ ۱۲

تدوینِ اصولِ فقہ (۴) گذشتہ سے پیوستہ

بہرحال، امام شافعی کی اس معرکۃ الآرا تصنیف "الرسالہ" کی اشاعت کے بعد تردید اجس طبقہ میں زیادہ کھل بلی مچی وہ یہی معتزلہ کا گروہ تھا۔ حالات ان کے سازگار تھے۔ مختلف جہات سے امام کی اس کتاب کے مقابلہ میں قلمی معرکہ آرائیاں شروع ہوئیں اور جس طرح معتزلہ کی طرف سے تردیدی اقدامات عمل میں آئے۔ امام شافعی کے حامیوں یعنی جماعت اہل حدیث کی طرف سے بھی امام کی تائید میں تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوا۔

غالباً یہی راز ہے [illegible] حنفی اپنی مشہور اصولی کتاب "میزان الاصول" میں یہ لکھنے کے بعد کہ:-

اعلم ان اصول الفقہ فرع لعلم اصول الدین فکان من الضرورۃ ان یقع التصنیف فیہ علی اعتقاد مصنف الکتاب۔	معلوم ہونا چاہیئے کہ اصول فقہ اصول دین کی فرع ہے اس لیئے ضروری ہے کہ اپنے عقیدے ہی کے مطابق ہر مصنف اپنی کتاب اس فن میں تصنیف کرے گا۔

اصول فقہ کی عام کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی مختلف نوعیتوں کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

واکثر التالیف فی اصول الفقہ لاھل الاعتزال المخالفین لنا فی الاصول ولاھل الحدیث المخالفین لنا فی الفروع۔ (کشف الظنون ص ۔)	اصول فقہ میں اکثر تالیفات یا تو فرقہ کی ہیں جو اصول میں ہمارے مخالف ہیں یا اُن اہل حدیث کی ہیں جو فروعی مسائل میں ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔

جس سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت امام کے "الرسالہ" کے بعد مسلمانوں میں جو اعتزالی عقائد رکھنے والے تھے اُنھوں نے تو تردیداً اور ارباب حدیث نے تائیداً اس فن کے متعلق کتابیں لکھنی شروع کیں، امام شافعی کی وفات تیسری صدی کے آغاز میں سنہ ۲۰۴ ہجری میں ہوئی اور طاش کبری زادہ کے حوالہ سے گذر چکا کہ یہی زمانہ معتزلہ کے قوت و اقتدار کا

تھا۔ اس لیئے غالب خیال یہی ہے کہ سب سے پہلے "الرسالہ" کے مقابلہ میں اس کتاب کے بعد جن لوگوں نے قلم اٹھایا وہ علماء معتزلہ ہی تھے۔ اصول کی کتابوں میں مختلف مسائل و نظریات کے سلسلے میں مشہور معتزلی عالم بلکہ اُن کے راس رئیس الجبائی اور اُس کے بیٹے ابو ہاشم کے حسن خاص خاص خیالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ تیسری صدی کی اُن ہی اعتزالی اصول فقہ کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ کوئی صریح شہادت تو اگرچہ مجھے ابھی نہیں ملی ہے۔ لیکن میرے اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ الجبائی (جس کا پورا نام محمد بن عبدالوہاب بن سلام ہے اور کنیت ابو علی کے نام سے مشہور ہے) امام ابو الحسن اشعری اور اسی الجبائی کے مناظرہ[1] کی مشہور داستان سے عموماً ارباب مدارس واقف ہیں۔ چونکہ یہ تیسری صدی کا معتزلی عالم ہے اس لیئے غالب خیال یہی گذرتا ہے کہ امام شافعی کے بعد اصول فقہ میں اعتزالی مسلک کی تائید کرتے ہوئے جس نے پہلی کتاب لکھی وہ الجبائی ہی ہے۔ الانساب میں سمعانی نے الجبائی کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

هو صاحب المقالات المعتزلة وكتاب التفسير والجامع والرد على اهل السنة

وہ "المقالات المعتزلہ" "کتاب التفسیر" اور "الجامع" اور "الرد علی اہل السنۃ" کا مصنف ہے۔

---

[1] امام ابو الحسن اشعری اہل سنت والجماعت کے ایک زبردست امام ہیں یہ الجبائی کے شاگرد تھے تاریخوں میں ان کے اور الجبائی کے کئی مناظروں کا حال لکھا ہے۔ ان میں سے ایک مناظرہ بہت دلچسپ ہے اس مناظرہ میں الجبائی کو ساکت کرنے کے بعد امام نے علیحدہ مسلک اختیار کیا، الجبائی کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ پر الاصلح یعنی سب سے بہتر پہلو کا کرنا واجب ہے۔ اشعری نے اعتراض کرتے ہوئے ایک مثال پیش کی کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں ایک بوڑھے کافر اور ایک بچہ کی پیشی ہوگی۔ بچہ دریافت کریگا کہ اس کو طویل عمر کیوں نہ عطا کی گئی تو اس کا جواب دیا جائیگا کہ چونکہ سن شعور کے بعد اس کے کفر وطغیان میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا اس لیے اس کو مصلحتاً بچپن ہی میں وفات دی گئی۔ لیکن جب کافر بوڑھا پیش ہوگا تو کفر کی سزا سنانے کے بعد وہ اعتراض کرے گا کہ جب اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہوگیا تھا کہ وہ کفر کریگا تو اس بچہ کے مانند اس کو بھی کیوں نہ وفات دی گئی۔ اس اعتراض کا کوئی معقول جواب الجبائی سے نہ بن پڑا۔ اس لیئے اشعری نے اس مسلک کے کھوکھلے پن کو تاڑ لیا اور بذات خود تحقیق شروع کی اور درجۂ امامت کو پہنچے۔ قاضی ابن خلکان نے الجبائی کے متعلق لکھا ہے کہ "كانت ولادة الجبائي

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

افسوس ہے کہ آج یہ کتابیں عام کتب خانوں میں نہیں پائی جاتیں اور نہ اس کا پتہ چل سکتا ہے کہ ان کتابوں میں سے الجبائی نے اصول فقہ کے مسائل کا تذکرہ اپنی کس کتاب میں کیا ہے اور یہی حال ان کے بیٹے ابو ہاشم کا ہے کہ اصولِ فقہ کی کتابوں میں بکثرت ابو ہاشم کے نظریات کا لوگ ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس فن پر اُس نے جو کتابیں لکھیں ہیں ان کا پتہ تو کیا چلیگا صحیح طور پر آج ہم ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ صرف ابن خلدون نے ابو الحسن بصری کی کتاب "المعتمد" کا تذکرہ کرتے ہوئے الجبائی کی کتاب "العهد" نامی کا ذکر کیا ہے اور "المعتمد" کو جس کا ذکر آگے آرہا ہے اسی کتاب کی شرح بنایا ہے۔ مگر قاضی ابن خلکان نے ابو ہاشم کے تذکرہ کو صرف ان الفاظ پر ختم کر دیا ہے۔

كان هو وابوه من كبار المعتزلة ولهما مقالات على مذهب الاعتزال وكتب الكلام مشحونة بمذاهبهما واعتقادهما[۲۹۲]	وہ اور اس کا باپ معتزلہ کی زبردست شخصیتوں میں سے تھے۔ اور ان دونوں نے اپنے مذہب کے متعلق بہت مضامین لکھے ہیں، علم الکلام کی کتابیں ان کے مذاہب اور اعتقادات کے بیان سے بھری ہوئی ہیں۔

بہرحال ابو علی الجبائی ہو یا ابو ہاشم، یہ دونوں چونکہ تیسری صدی کے رؤساء اعتزال ہیں کیونکہ ابو ہاشم کی ولادت بھی ۲۴۷ ہجری میں ہوئی اور وفات ۳۲۱ ہجری میں۔ اس لیے میرا یہی خیال ہے کہ معتزلہ کی طرف سے "الرسالہ" کے جواب میں جن اربابِ تصنیف نے کام کیا غالباً وہ یہی باپ بیٹے یعنی ابو علی الجبائی اور ابو ہاشم معتزلی ہیں۔ اس کا ایک قرینہ میرے خیال میں یہ بھی ہے کہ اصولی مسائل کے متعلق ان دونوں سے پہلے معتزلی علماء میں کسی کے نظریات کا ذکر عموماً کتابوں میں نہیں پایا جاتا۔

الحاصل امام شافعی کے "الرسالہ" کے بعد تیسری صدی میں اصول فقہ کے نظریات جن

حاشیہ صفحہ گذشتہ: ۔۔۔ سنة خمس وثلاثين ومائتين (۲۳۵ھ) وتوفى فى شعبان سنة ثلث وثلثمائة (۳۰۳ھ)
"اسی کتاب میں لفظ الجبائی کی تحقیق کرتے ہوئے ابن حوقل کے حوالہ سے لکھا ہوا ہے" ان جبى مدينة و متاق۔ ۔۔۔ مشتبك لها مربا لنخل وقصب السكر وغيرها" یعنی جبی ایک شہر وسیع بازاروں والا ہے آبادی گھنی ہے اور نخلستان و گنے وغیرہ گھری ہوئی ہے۔ ۱۲

معتزلی علماء کی طرف کتابوں منسوب کئے جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں نام ان ہی دونوں باپ بیٹوں (یعنی ابو علی الجبائی اور ابو ہاشم) کا نظر آتا ہے۔

امام الہدی الماتریدی اور اصول فقہ

البتہ ہماری علمی تاریخ ان لوگوں کے بعد کتاب کی حیثیت سے "اصول فقہ" کی جس کتاب کا پتہ بتاتی ہے وہ تیسری صدی ہجری کے مشہور حنفی امام علامہ امام الہدی ابو منصور الماتریدی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کا پورا نام محمد بن محمد بن محمود ہے۔ ابو منصور کنیت تھی۔ امام الہدی امت کی طرف سے خطاب دیا گیا تھا چنانچہ الجواہر المضیہ میں ہے۔

ہو لقب رئیس اہل السنۃ من الحنفیۃ اعنی الامام ابو المنصور الماتریدی رحمۃ اللہ علیہ۔ (ص...)	وہ اہل السنت والجماعت میں احناف کے ایک بڑے نامور شخص کا لقب ہے یعنی امام ابو منصور الماتریدی رحمۃ اللہ علیہ۔

ان کی وفات کا سن ۳۳۳ ہجری بتایا جاتا ہے اگرچہ امام کے سن ولادت کا علم مجھے باوجود تلاش کے نہ ہو سکا، تاہم امام کے اساتذہ میں جن بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے ان میں ایک ابو نصر العیاضی بھی ہیں اور العیاضی کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ یہ آل سامان کے مشہور امیر نصر[1] بن احمد بن اسد بن سامان الکبیر کے زمانے میں کفار ترک کی ایک جنگ میں دشمنوں کے ہاتھ میں قید ہو کر شہید ہوئے الجواہر المضیہ میں ہے کہ۔

اسرہ الکفرۃ فقتلوہ صبراً فی دیار الترک فی ایام نصر بن احمد بن اسد بن سامان الکبیر (ص...)	کافروں نے ان کو (العیاضی کو) نصر بن احمد بن اسد بن سامان الکبیر کے عہد میں قید کیا۔ اور باندھ کر قتل کر دیا۔

جس کے یہی معنی ہوئے کہ العیاضی کی شہادت ۲۵۹ھ سے پہلے ہوئی کیونکہ جیسا کہ میں نے حاشیہ میں لکھا ہے امیر نصر کی وفات اسی سن میں ہوئی ہے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ امام ابو منصور

---

[1] کتابوں میں لکھا ہے کہ نصر کے دادا سامان بہرام چوبین کے خاندان سے تھے خلیفہ مامون الرشید عباسی اپنی ولی عہدی کے زمانے میں خراسان کے گورنر تھے، بعض امیروں کے اشارے سے انھوں نے خاندانی شرافت کا خیال کر کے خراسان کے مختلف صوبوں پر اسد بن سامان کے لڑکوں کو بحال کیا۔ یوں اس خاندان میں حکومت آئی۔ کئی پشتوں تک ماوراء النہر وغیرہ پر اس خاندان کے افراد حکومت کرتے رہے امیر نصر کا پایہ تخت سمرقند تھا۔ ۲۵۹ھ ہجری میں اس کی وفات ہوئی۔

سنہ ۲۵۹ھ سے پہلے نہ صرف یہ کہ پیدا ہو چکے تھے بلکہ وہ العیاضی سے علمی استفادہ بھی کر چکے تھے اور نہ صرف شاگردانہ استفادہ ہی بلکہ اُن کے بلند مرتبہ تلامذہ میں ایک امتیاز اور درجہ شہرت بھی حاصل کر چکے تھے۔ "جواہر مضیہ" میں العیاضی کے ذکر میں ہے:۔

لما استشهد خلف اربعین رجلاً من اصحابہ کانوا من اقران ابی منصور الماتریدی (الجواہر)	جب ابو نصر عیاضی شہید ہوئے تو اپنے پیچھے اُنھوں نے چالیس شاگرد ایسے چھوڑے جو سب ابو منصور ماتریدی کے جوڑ کے تھے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عیاضی کی زندگی ہی میں ابو منصور ماتریدی اپنے علم و فضل میں ممتاز شہرت و عظمت حاصل کر چکے تھے۔ حتی کہ دوسروں کے فضل و علم کا پیمانہ اُن کو بنایا جاتا تھا۔

بہر حال اِن معلومات سے میں اس نتیجہ تک پہنچتا ہوں کہ ابو منصور ماتریدی کی نہ صرف ولادت سنہ ۲۵۹ھ ہجری سے پہلے ہوئی بلکہ اقران و اماثل میں ان کو کافی امتیاز بھی اُس زمانہ تک حاصل ہو چکا تھا۔ پس اگر ان کی عمر علم و فضل کے اس امتیاز کے وقت صرف ۲۰ سال کی بھی مانی جائے ... . جب بھی ان کا سنہ ولادت ۲۴۰ ہجری سے پہلے ہونا چاہیئے، گویا ان کا زمانہ اور ابو ہاشم معتزلی (سنہ ۲۴۷ھ تا سنہ ۳۲۱ھ) کا زمانہ ایک ہی ہے۔ پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا اصول فقہ میں ابو ہاشم کی تو کسی کتاب کے نام کا پتہ نہ چل سکا لیکن بحمد اللہ اس معتزلی عالم کے معاصر امام اہلسنت ابو منصور ماتریدی کی دو کتابوں کا ذکر اس سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔

(۱) "کتاب الجدل" لابی منصور محمد بن محمد الماتریدی و ہو متعلق باصول الفقہ (ج ۲ ص ۱۲۳)	"کتاب الجدل" جو ابو منصور ماتریدی کی تصنیف ہے وہ اصول فقہ کے متعلق ہے۔
(۲) و "ماخذ الشرائع" فی اصول الفقہ لابی منصور محمد بن محمد الماتریدی (ج ۲ ص ۲۱۰)	"ماخذ الشرائع" جو اصول فقہ کے موضوع پر ابو منصور محمد بن محمد الماتریدی کی تصنیف ہے

کشف الظنون میں دوسری کتاب کا نام یہی ہے لیکن دوسری کتابوں میں عموماً "ماخذ الشرائع"

نام بتایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ کتابیں بھی میری نظر سے نہیں گزری ہیں اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ ان کے نسخے اب دنیا کے کتب خانوں میں کہیں پائے جاتے ہیں یا نہیں، لیکن جہاں تک ان دونوں کتابوں کے نام سے معلوم ہوتا ہے قیاس چاہتا ہے کہ ان میں سے "کتاب الجدل" دراصل اس فن کی ان کتابوں کی قدح میں لکھی گئی ہوگی جن کی طرف علامہ شمس النظر علاء الدین نے اپنے ان الفاظ سے اشارہ کیا تھا جن کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ:۔

اکثر التالیف فی اصول الفقہ لاہل الاعتزال المخالفین لنا فی الاصول ولاہل الحدیث المخالفین لنا فی الفروع۔	اصول فقہ میں اکثر تالیفات یا تو فرقہ معتزلہ کی ہیں جو ہمارے اصول میں مخالف ہیں یا اہل حدیث کی جو ہم سے فروعی مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ اب تک اصول فقہ میں کتابیں جو کچھ لکھیں گئی تھیں وہ یا تو ان بزرگوں کی تھیں جن کا نام اس زمانے میں اہل الحدیث تھا۔ بظاہر یہ امام شافعی کے حماۃ اور اتباع کی تعبیر ہے، یا ان کے مقابلہ میں ارباب اعتزال نے قلم اُٹھایا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں امام ابو حنیفہ کے مکتب خیال کے علماء خاموش تھے، بشرطیکہ یہ بات مان لی جائے کہ ابو یوسف القاضی اور امام محمد کی طرف اِس فن کی کتابوں کے لکھنے کا جو کتابوں میں ذکر کیا جاتا ہے وہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ امام شافعی کے "الرسالہ" کی اولیت کا دعویٰ اس سے غلط ہو جاتا ہے اور میں کہہ چکا ہوں کہ اس مسئلہ پر تقریباً اجماع قائم ہو چکا ہے۔ بہرحال میرا بھی ذاتی خیال یہی ہے کہ امام ابو یوسف ہوں یا امام محمد یہ تو ممکن ہے کہ اپنے درسوں میں شاگردوں کو یہ حضرات ایسے کلیات بتاتے ہوں جن پر ان کے اُستاذ ابو حنیفہ اور خود ان بزرگوں کے اجتہاد کی بنیاد قائم ہے۔ لیکن اِن کلیات کو اُنھوں نے کسی کتاب میں مدون بھی کیا تھا؟ ۔ شاید یہ واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ حنفی علماء میں جس شخص نے پہلی دفعہ تدوینی قالب میں ان مسائل کو ڈھالا وہ غالباً یہی امام الہدیٰ ابو منصور ماتریدی ہیں۔

پھر جیسا کہ دنیا جانتی ہے کہ امام ابو منصور کی اصلی شہرت فقہ اور اصول فقہ میں نہیں ہے بلکہ ان کے علمی مجاہدات کا حقیقی میدان عقائد اور علم کلام ہے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی اسی لئے

ان کا ترجمہ شروع کرتے ہوئے۔

امام المتکلمین و مصلح عقائد المسلمین (فوائد بھیہ ص۸۰)

متکلمین کے امام اور مسلمانوں کے عقائد درست کرنے والے

کے الفاظ سے اُن کو روشناس کراتے ہیں اور ہے بھی یہی بات۔ گویا تیسری صدی کے نصف آخر میں ایک طرف تو بصرہ کی جامع مسجد کے منبر پر

من عرفنی فقد عرفنی ومن لم یعرفنی فانا اعرفه بنفسی

جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا ہیں اسے اپنے آپ کو خود پہچنواتا ہوں۔

کہتے ہوئے امام ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ علیہ اعلان کر رہے تھے کہ

انا تائب مقلع معتقد للرد علی المعتزلة مخرج لفضائحهم ومعائبهم (ابن خلکان ص۳۲۷)

میں عقائد معتزلہ سے تائب ہو چکا ہوں اور اب اس بات کا پختہ ارادہ کر چکا ہوں کہ ان کے عقائد کی جڑیں اکھاڑ دوں گا اور اُن کی شرمناک باتیں اور اُن کی لغویتیں بیان کروں گا

جس کی وجہ سے عراق کے معتزلہ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی بلکہ بقول ابوبکر الطرفی ۔

كانت المعتزلة قد رفعوا رؤسهم حتى اظهر الله الاشعری فحجرهم فی اقماع السمسم (ابن خلکان ص۳۲۷)

معتزلہ بہت سر اُٹھا چلے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے امام اشعری کو ظاہر فرمایا پس انھوں نے اس گروہ کو السی کے ڈھیر میں روک دیا (کہ اس سے وہ کوشش کے باوجود نہیں نکل سکتے)

اور دوسری طرف ان ہی دنوں میں خراسان کے معتزلہ میں یوں بھگدڑ مچی ہوئی تھی کہ سمرقند کے ایک محلہ میں ماترید[1] سے ایک نوجوان عالم اُٹھ کر ان پر تیر پر تیر برسا رہا تھا اور اس طور پر برسا رہا تھا کہ دم لینے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ رد معتزلہ میں ان کی کتابوں کے نام گناتے ہوئے مورخین نے لکھا ہے کہ:-

له کتاب بیان اوهام المعتزلہ

انھوں نے کتاب بیان اوہام معتزلہ" اور

[1] مولانا شبلی مرحوم نے "علم الکلام" میں ماترید کو سمرقند کا ایک گاؤں بتایا ہے لیکن سمعانی نے "کتاب الانساب" (بقیہ بر صفحہ آیندہ)

وكتاب رد اهل الادلة للكعبی وكتاب المقالات وكتاب التوحيد ورد اصول الخمسة وغيرها (الجواهر الفوائد)	کعبی کی کتاب "اصل الادلہ" کا رد اور کتاب المقالات" "کتاب التوحید اور رد اصول الخمسہ" وغیرہ لکھی ہیں۔

اور صرف معتزلہ ہی نہیں بلکہ ملاحدہ، قرامطہ، روافض یہ سب پر چونکہ چلا رہے تھے ان کی ممتاز تصنیفات کے بیان میں لکھا جاتا ہے۔

وله رد الامامة لبعض الروافض والرد على القرامطة (فوائد بهية صفحہ)	بعض رافضیوں کی کتاب "الامامۃ" کا رد اور "الرد علی القرامطہ" بھی ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔

امام ابوالمنصور ماتریدی اور حنفی مکتب خیال کی حمایت

لیکن ہمارے یہ امام ابوالمنصور جہاں ان باطل فرقوں قرامطہ، روافض اور بعض دیگر ملاحدہ پر تابڑ توڑ گولہ باری کر رہے تھے وہیں اہل السنت والجماعت کے ان لوگوں کے مقابلہ میں بھی وہ کھڑے ہوگئے تھے جو حنفی مکتب خیال پر معترض تھے خصوصاً وہی فرقہ جو اپنے آپ کو اہل الحدیث کے نام سے موسوم کرتا تھا اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان میں شوافع زیادہ تھے بلکہ اس زمانے میں شاید شافعیوں کی یہ دوسری لفظی تعبیر تھی چونکہ عقائد اعتزال سے تائب ہونے کے بعد امام ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی قریب قریب اہل الحدیث ہی کا مسلک اختیار فرمالیا تھا بلکہ ابن خلکان کا تو بیان ہے کہ۔

كان ابو الحسن يجلس ايام الجمع	امام ابوالحسن جمعہ کے دن ابو اسحاق المروزی

[illegible] (صفحہ۱۳) میں یہ لکھ کر کہ اس لفظ کے دو تلفظ ہیں بعض لوگ "ماترید" کہتے ہیں اور بعض "ماتریت" آگے یہ الفاظ درج [illegible] ہیں "نسبة الى محلة من حائط سمرقند" جس کا مطلب یہی ہوا کہ سمرقند کی فصیل کے اندر کا محلہ یہ ماترید یا ماتریت ہے، اگرچہ علامہ مرتضیٰ الزبیدی البلگرامی نے شرح احیاء العلوم میں "محلہ بہ سمرقند او قریہ بھا" (ص۲۰) لکھ کر شبہ ہی ڈال دیا اور غالباً مولانا نے ان ہی پر اعتبار کیا لیکن سمعانی جب لکھتے ہیں کہ خرجت الیہا غیر مرة (یعنی ماترید کو متعدد بار میں گیا ہوں، صفحہ۹۰) [illegible] ترجیح ان ہی کے قول کو ہونی چاہیئے البتہ اگر حائط کا ترجمہ دیوار اور فصیل کے جو اس کے مشہور معنی ہیں نہ کیا جائے [illegible] دیا جائے تو پھر علامہ زبیدی کے قول کی بھی گنجائش ہو سکتی ہے ۱۲

فی حلقة ابی اسحاق المروزی الفقیہ الشافعی فی جامع منصوریہ بغداد [1]	الشافعی کے فقہ کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے جو جامع منصوریہ بغداد میں ہوتا تھا۔

اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ گروہ شافعیہ ہی سے ان کا تعلق تھا[1]۔ یہی وجہ ہے کہ الاشعری اور الماتریدی اگرچہ دونوں کا تعلق اہل السنت والجماعت ہی سے ہے اور عام طور پر طبقہ اہل سنت میں دونوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض جزئی مسائل کا چونکہ ان دونوں میں کچھ اختلاف بھی تھا، ایک کا رجحان فرقۂ اہل حدیث وشوافع کی طرف تھا اور دوسرے (ماتریدی) حنفی مسلک کی تائید کرتے تھے۔ بلکہ علامہ مرتضیٰ الزبیدی البلگرامی نے ابن البیاضی کے حوالے سے تو یہاں تک نقل کیا ہے کہ:۔

ان الماتریدی مفصل لمذهب الامام ابی حنیفة واصحابه (شرح احیاء العلوم)	الماتریدی امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے مذہب کی تفصیل وتشریح بیان کرنے والے ہیں۔

بہرحال اس لیئے عموماً احناف اعتقادی مسائل میں بجائے الاشعری کہنے کے اپنے آپکو الماتریدی کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ابن اثیر نے تو کامل میں لکھا ہے کہ:۔

هذا مما یستطرف ان یکون حنفی اشعریاً	یہ عجیب بات ہوگی کہ کوئی حنفی اشعری ہو۔

بہرحال اہل سنت والجماعت کے ان دونوں اماموں کو اگرچہ معتزلہ اور غیر سنی فرقوں کے مقابلہ میں ایک درجہ میں سمجھا جاتا ہے لیکن اپنے اپنے رجحان کے مطابق شوافع زیادہ تر الاشعری کے اور احناف ماتریدی کے کلامی مسائل میں پیرو ہیں۔ صاحب "طبقات الحنفیہ" نے الماتریدی کا ترجمہ درج کرتے ہوئے ان کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

مات سنه ثلاث وثلاثين وثلاث مائة بعد وفات ابی الحسن الاشعری بقلیل (ص۱۳۰)	۳۳۳ھ ہجری میں امام ابوالحسن الاشعری کی وفات کے چند ہی دن بعد ان کی وفات ہوئی

واللہ اعلم الماتریدی کی وفات کے بعد ابوالحسن الاشعری کی وفات کا ذکر کیوں کیا گیا؟ غالباً

---

[1] اگرچہ قاضی عیاض مالکی وغیرہ کا دعوی ہے کہ فروعاً الاشعری مالکی تھے لیکن شرح احیاء العلوم میں جو مباحث اس دعوی کے متعلق نقل کئے ہیں ان سے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ وہ شافعی المذہب تھے واللہ اعلم ۱۲۔

اس لیے کہ دونوں ایک ہی میدان کے مرد تھے (یعنی معتزلہ میں) اور ممکن ہے کہ باہمی چشمک جو ان دونوں میں تھی اس کی طرف ہی اشارہ ہو۔

خیر مجھے کہنا یہ ہے کہ آخر وقت تک وہ حالت تو باقی نہ رہی جیسا کہ ابن اثیر نے لکھا ہے "حنفی اشعری نہیں ہو سکتا" بلکہ پچھلوں میں باوجود حنفی ہونے کے کچھ لوگ اشعریت کی طرف مائل رہے جیسے کہ حنفیوں میں بعض لوگ عقیدۃً معتزلی بھی تھے تاہم یہ بات آخر تک باقی رہی جیسا کہ الجواہر المضیہ کے خاتمہ میں فتاویٰ صیرفیہ کے حوالہ سے الماتریدی کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ:۔

اتباعہ من الحنفیۃ اکثر ۔ ابوالحسن الاشعری اتباعہ من الشافعیۃ اکثر (ص۵۶۶)	الماتریدی کے پیروی کرنے والے اکثر حنفی ہیں۔ اور الاشعری کے پیروی کرنے والے اکثر شافعی ہیں۔

میری غرض اس واقعہ کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ الماتریدی اور الاشعری کے ان تعلقات کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو الماتریدی کی کتاب "کتاب الجدل" کی نوعیت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصول فقہ کی یہ کتاب جب "جدلی" انداز میں حنفیوں کی طرف سے جیسا کہ میرا خیال ہے۔ پہلی دفعہ پیش ہوئی تو اس میں ایک طرف الماتریدی نے جہاں معتزلہ کے ان خاص نظریات کو رد کیا ہوگا جو اصول فقہ میں وہ رکھتے تھے تو وہیں اس میں غالب قرینہ ہے کہ ان لوگوں کے خاص مسائل سے بھی انہوں نے بحث کی ہوگی جنہیں علامہ شمس الشرتے "المجاہدین لنا فی الفروع" قرار دیا یعنی اہل حدیث کہئے یا شوافع گویا ایک طرف الماتریدی نے بقول البیاضی امام ابوحنیفہ کے اعتقادی مسلمات کی شرح و توجیہہ اور تائید و نصرت کا کام انجام دیا اور دوسری طرف اصولی حنفی فقہ کے ان بنیادی اصول کی تشریح و تاویل کی خدمت انجام دی جو اگرچہ کتابوں میں ابھی مدون نہیں ہوئے تھے لیکن سینہ بسینہ حنفی مکتب خیال کے علماء میں منتقل ہوتے چلے آرہے تھے۔

الماتریدی کے متعلق جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ العیاضی کے شاگردوں میں ہیں اور العیاضی نے امام ابوبکر بن احمد بن اسحاق الجوزجانی[1] سے تعلیم حاصل کی اور وہ امام محمد بن حسن الشیبانی کے تلمیذ شہیر ابو سلیمان

[1] جوزجان در اصل بلخ کے قریب ایک شہر کا نام ہے۔ السمعانی نے یہی لکھا ہے "جیم" کے پیش کے ساتھ اس کا تلفظ ہے۔ بڑے بڑے علماء اس شہر سے اٹھے ہیں۔

موسیٰ بن سلیمان الجوزجانی[1] کے شاگرد ہیں گویا ابن تریدی اور امام محمد کے درمیان تین واسطے ہیں -
میں نے الماتریدی کے اس تعلیمی شجرہ کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ابوسلیمان موسیٰ بن سلیمان الجوزجانی کے متعلق کتابوں میں لکھتے ہیں :-

اخذ الفقه عن محمد وكتب مسائل الاصول والامالى (الفوائد، صفحہ ۹۰)	امام محمد سے انھوں نے علم فقہ حاصل کیا اور آپ سے مسائل اصول اور ان کے درس کے لکھ لیے۔

جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقہ کے ساتھ اصول کے مسائل بھی انھوں نے امام محمد سے لکھے تھے -
نیز صاحب الطبقات الحنفیہ معلی بن منصور کے ترجمہ میں یہ لکھکر کہ :-

روى عن ابى يوسف ومحمد الكتب والامالى والنوادر (صفحہ)	انھوں نے امام ابو یوسف اور امام محمد سے کتابیں "الکتب" اور "النوادر" کی روایت کی

آگے یہ اضافہ کرتے ہیں کہ -

شاركه فى ذالك ابوسليمان الجوزجانى۔	ابوسلیمان الجوزجانی نے اس کام میں ان کے ساتھ شرکت کی۔

جس کا بظاہر یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ معلی کے ساتھ ابوسلیمان نے بھی دونوں اماموں ابو یوسف اور محمد سے فقہ حنفی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ حاشیہ میں میں نے علی قاری کے حوالہ سے خلف بن ایوب کا جو قول نقل کیا ہے کہ "حسن بن سلیمان کے پاس خلف نے امام کی بہت سی چیزیں اور صحیح کتابیں پائی تھیں" اور وہاں میں نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ دونوں کی ولدیت کی نسبت سلیمان کی طرف اگر اس کی دلیل ہو سکتی ہے کہ یہ دونوں بھائی تھے، حسن بڑے ہوں، اس لیے اُن کو تو براہ راست امام ابوحنیفہ سے پڑھنے کا موقع ملا ہو اور ابوسلیمان موسیٰ چھوٹے ہوں، اس لیے وہ خود امام سے نہ پڑھ سکے ہوں۔ بلکہ ان کے دونوں شاگردوں ابو یوسف اور محمد سے اُنھوں نے پڑھا ہو، جب یہ معلوم ہے کہ "جوزجانی" بھی بلخ ہی کے

---

[1] یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ملا علی قاری نے مناقب الامام الاعظم میں "بلخ" کے ذیل میں لکھا ہے "والحسن بن سلیمان من کبراء بلخ" اس کے بعد خلف بن ایوب جو ترمذی کے رواۃ میں ہیں ان کا قول نقل کیا ہے کہ "وجدنا عنده للامام شيئا كثيرا وكتبا مصححة" صفحہ ۵ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کی مجلس کی کتابیں بتدائی میں کہاں تک پہنچ گئی تھیں، گو صراحت تو ملی نہیں لیکن سلیمان حسن کے والد کا نام بھی ہے اور موسیٰ کے والد بھی سلیمان ہیں کیا دونوں بھائی تھے ؟ ۱۲ -

ضلع میں تھے۔ تو اس صورت میں یہ خیال اور زیادہ قرین قیاس ہو جاتا ہے۔

بہرحال مندرجۂ بالا معلومات سے دو باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) الجوزجانی جو الماتریدی کے بدو واسطہ استاذ ہیں "فقہ" کے سوا انہوں نے امام محمد سے "الاصول" کے مسائل بھی لکھے تو۔

(۲) الجوزجانی کے وطن بلخ میں حنفی مکتب خیال کی اساسی کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔

امام کی تصنیفات اس صورت میں اگر الجوزجانی کے ذریعہ یہ اصول کے یہ مسائل ان کے شاگرد احمد بن اسحاق ابوبکر تک پہنچے اور احمد بن اسحاق سے العیاضی تک اور پھر العیاضی سے چونکہ امام ابو منصور ماتریدی نے تعلیم حاصل کی اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ اصول کے یہ مسائل بھی ان تک پہونچے اور اس کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنی کتابیں اصول فقہ میں لکھیں۔ "کتاب الجدل" میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے نہ صرف فقہ حنفی کے اصول ہی کو پیش کیا گیا ہے بلکہ جن مسائل میں معتزلہ اور اہل الحدیث (شوافع) سے اختلاف تھا ان پر بھی بحث کی گئی ہے۔ البتہ "ماخذ الشرائع" ان کی کتاب ایسی معلوم ہوتی ہے جس میں مناظراتی رنگ سے زیادہ صرف حنفی نقطۂ نظر کے اصول فقہ کے مسائل پر غالباً بحث کی گئی ہو یہ میرا ایک خیال ہے ورنہ تحقیقی رائے تو کتاب دیکھنے کے بعد ہی قائم کی جا سکتی ہے اور کہہ چکا ہوں کہ اس لحاظ سے دونوں کتابوں میں سے کسی ایک تک بھی میری رسائی نہیں اور نہ کسی ایسے آدمی سے ملاقات ہوئی ہے جن کی نظر سے یہ کتابیں گذری ہوئی ہوں بلکہ اسلامی علوم کے مورخین کی کتابوں میں بھی کسی قسم کی تفصیلی معلومات ان کتابوں کے متعلق نہیں ملتے لیکن امام الہدیٰ کی طرف ان کتابوں کا منسوب ہونا خود ان کی جلالت شان کے لئے کافی ہے۔ کاش جس طرح شوافع نے "الرسالہ" کو شائع کیا ہے حنفی طبقہ کے مسلمان اپنے اصول فقہ کی ان کتابوں کو جو میرے نزدیک حنفیوں کی پہلی کتابیں ہیں شائع کر سکتے کہ تاریخی ندرت کے سوا جہاں تک میرا خیال ہے بہت سی نئی باتیں شاید ان کتابوں سے ہاتھ آ سکتی تھیں، کیونکہ گو اس زمانہ میں امام الہدیٰ کی تصنیفات کا اکثر حصہ نابید ہو چکا ہے۔ لیکن ان کی کتاب "تاویلات القرآن" کا نسخہ دنیا میں ابھی پایا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے علم الکلام میں لکھا ہے "تاویلات القرآن کا تمام نسخہ ہماری نظر سے گذرا ہے۔ (صفحہ ۹۱) اور بھی بعض لوگوں سے سنا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ کے کسی کتب خانے میں اس کتاب کا

الماتریدی چونکہ العیاضی کے نامور شاگردوں میں ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ ان سے جیسا سب کچھ سیکھا تھا اصول کے مسائل نہ سیکھے۔ یہاں ایک اور چیز بھی قابل ذکر ہے لکھا ہے کہ العیاضی کے دو بیٹے تھے جس میں ایک کا نام ابو احمد عیاضی تھا۔ فتاوی ظہیریہ میں ہے "کان ابو احمد آیۃ حتی قال فیہ من قال من المدلین علی صحۃ مذہب ابی حنیفۃ کون الامام ابی احمد العیاضی علی مذہبہ یعنی ابو احمد خدا کی ایک نشانی تھے کہنے والوں نے کہا ہے کہ ابو حنیفہ کے مذہب کی صحت کی ایک دلیل امام ابو احمد عیاضی کا حنفی ہونا بھی ہے۔ دیکھو خاتمۂ الجواہر المضیئہ۔

کوئی نسخہ موجود ہے۔ خود مولٰینا شبلی نے تو کوئی خاص رائے اس کتاب کے متعلق ظاہر نہیں کی ہے لیکن عبدالقادر المصری نے جواہر میں "تاویلات القرآن" کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

وھو کتاب لا یوازیہ فیہ کتاب بل لا یدانیہ شئ من تصانیف من سبقہ فی ذالک الفن (ص۱۳۱)	یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے ہم پلہ کوئی اور کتاب نہیں ہے بلکہ جن لوگوں نے اس سے پہلے اس فن میں کتابیں لکھی ہیں وہ اس کتاب کے (معیار کے) قریب بھی نہیں ہیں۔

جس سے امام الہدیٰ کی تصنیفی قوت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس بنیاد پر میرا خیال ہے کہ اصول فقہ کی یہ دونوں کتابیں بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے یقیناً قابلِ قدر رہوں گی۔ آخر کوئی بات ہی تو تھی جو علمائے احناف نے ان کو کلامی مسائل میں اپنا امام تسلیم کرلیا ہے بلکہ علامہ مرتضیٰ بلگرامی زبیدی نے تو ایک قول یہاں تک نقل کیا ہے کہ وہ (امام الہدیٰ ابومنصور)۔

کان مھدای الامۃ فی عھدہ (شرح احیاء العلوم ص۵)	وہ اپنے زمانے کے مہدی امت تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حنفیوں میں اصول الفقہ کی پہلی کتاب کی حیثیت سے باضابطہ کتابی شکل میں جو اب تک پتہ چلا ہے وہ انہی امام ابومنصور الماتریدی کی یہی دو کتابیں "کتاب الجدل" اور "ماخذ الشرائع" ہیں سو اللہ علم بحقیقۃ الحال

امام ابوبکر الجصاص الرازی

البتہ امام الہدیٰ کے بعد جس حنفی عالم کی کتاب کا ذکر اصول فقہ کی کتابوں میں . . . کیا جاتا ہے وہ امام ابوبکر الجصاص الرازی ہیں جن کا نام احمد بن علی ہے اور الجصاص کے لقب سے مشہور ہیں السمعانی نے تو لکھا ہے:۔

ھذہ النسبۃ الی العمل بالجص	یہ ان کے پیشہ کی طرف نسبت ہے جو وہ گچی کا کام کیا کرتے تھے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ جص (گچی) بنانے کا کام کرتے تھے اور بظاہر اس میں تعجب بھی نہیں ہے۔ الخطیب نے ان کے ترجمہ میں جب تصریح کی ہے۔

خوطب ان یلی القضاء فامتنع واعید علیہ الخطاب فلم یفعل [۱]	عہدہ قضاء پیش کیا گیا اور انھوں نے انکار کیا۔ دوبارہ پیش کیا گیا اور انھوں نے قبول نہیں کیا۔

[۱] احناف میں قضاء سے انکار کا رواج کوئی نئی بات نہیں ہے امام ابوحنیفہ کا قصہ تو مشہور ہی ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباس دونوں حکومتوں نے آپ کو حکومت کی ملازمت پر مجبور کیا لیکن آپکو انکار ہی پر اصرار رہا اس راہ میں آپکو شدائد سے گذرنا پڑا۔ غالباً امام ہی کی سنت ان کے اتباع میں

(بقیہ حاشیہ برصفحۂ آئندہ)

ظاہر ہے کہ جن کے دماغوں کی بلندی کا یہ حال ہو وہ اگر کبھی بنا کر دنیا کی چند چلنے والی سانسوں کو پوری کرنے کا عزم کر چکے ہوں تو کیا تعجب ہے۔

بہرکیف الجصاص کے متعلق عام کتابوں میں ان کی دوسری تصنیفات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ:

له کتاب مفید فی اصول الفقه (الجواهر ص ۸۵ ج ۱)	اصول فقہ میں ان کی ایک مفید کتاب ہے۔

آپ سن چکے ہیں کہ امام الہدیٰ کی وفات ۳۳۳ھ ہجری میں ہوئی اب الجصاص کے متعلق الجواہر میں ہے

مولده خمس و ثلاث مائة و سکن بغداد (ص ۸۴) — ۳۰۵ھ ہجری میں پیدا ہوئے بغداد میں سکونت اختیار کی

جس کا مطلب یہ ہوا کہ امام الہدیٰ کی جس سال وفات ہوئی الجصاص اس وقت ۲۸ سال کے جوان تھے شہر رے کی طرف ان کا انتساب بتاتا ہے کہ وہ ان کا اصلی وطن تھا۔ اگرچہ مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے واللہ اعلم کس ماخذ سے نقل کیا ہے۔

کان مولده ببغداد سنة ۳۰۵ (الفوائد مطبوعہ دیوبند) — بغداد میں ۳۰۵ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔

صیمری ... کی مشہور کتاب "اخبار ابی حنیفہ و اصحابہ" ہے اور پانچویں صدی ہجری کے مستند عالموں میں ہیں خصوصاً طبقات حنفیہ میں ان کی رائے بہت وقیع سمجھی جاتی ہے۔ ان کے حوالہ سے "جواہر المضیئہ" میں الجصاص کے متعلق نقل کیا ہے:-

دخل بغداد سنة خمس و عشرین و ثلاثمائة — بغداد میں ۳۲۵ھ ہجری میں آئے اور الکرخی کے درس میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)
جاری تھی۔ الجوزجانی موسیٰ بن سلیمان جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے "جواہر مضیئہ" میں بھی ان کے متعلق یہی لکھا ہے کہ مامون الرشید نے ان پر قضاء کا عہدہ پیش کیا لیکن جوزجانی نے معافی چاہی، مامون نے خوشی سے ان کو چھوڑ دیا پھر ان کے رفیق درس معلیٰ کو بلایا مگر انھوں نے بھی انکار ہی کیا الجصاص کے استاد الکرخی کے متعلق بھی لکھا ہے کہ "کان صبوراً علی الفقر والفاقة" اور یہ بھی لکھا ہے کہ قضا کے لئے ان کو کہا گیا لیکن راضی نہ ہوئے۔ ان کی غربت کا یہ حال تھا کہ آخر عمر میں فالج پڑا گھر میں کچھ نہ تھا جو علاج معالجہ ہوتا۔ شاگردوں نے سیف الدولہ حمدان کے پاس ان کا حال لکھ بھیجا۔ اس وقت دس ہزار درہم اس نے روانہ کئے پہونچنے سے پہلے الکرخی کو کسی نے خبر کر دی دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا "اللھم لا تجعل رزقی الا من حیث عودتنی" (یعنی پروردگار میری روزی جس عادی طریقہ سے ملتی تھی اس کے سوا دوسری راہ سے نہ دیجئے) دعا قبول ہوئی سیف الدولہ کی امداد اس وقت پہنچی جبکہ وفات پا چکے تھے۔ انہی علماء پر الزام لگایا جاتا ہے کہ علم دنیا کے لئے حاصل کرتے تھے۔ اسلامی علوم کی کساد بازاریوں کا سبب حکومتوں کی ناقدریاں ٹھہرائی جا رہی ہیں، لیکن جن لوگوں کی یہ شکایت ہے ان کو سلف کے علماء کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ باوجود قدر شناسیوں کے ان بزرگوں نے اس کو علم سمجھا اور نہ دین جس کی گاڑی حکومت کھینچتی ہو آپ دیکھ رہے ہیں سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جو اس پیسے کو لینا نہیں چاہتے تھے دعا کرتے تھے کہ پہنچنے سے پہلے مجھے اٹھا لیا جائے۔ دین اور قوم کے یہی خدام ہیں اکابر اسلام تھے۔

—(٭)—

ودرس علی الکرخی (ج ۱ ص۸۵) — شریک ہوئے

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ الجصاص بغداد با ہرت اُس وقت آئے جب ان کی عمر قریب قریب بیس سال کی تھی اور یہی بات صحیح بھی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اگر بغداد ہی جائے پیدائش ہوتی تو الرازی کی نسبت سے غالباً مشہور نہ ہوتے[۱]۔ جہاں تک میرا خیال ہے بغداد آنے سے پہلے جصاص کو علم حاصل کرنے کا موقع اپنے وطن میں نہیں ملا کیونکہ ان کے اساتذہ کی فہرست میں کوئی آدمی خراسان و ایران کا نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ ان کا خاندانی پیشہ سپاہی ہی کا ہو جب تک وطن میں رہے ہوں اس پیشے میں مشغول رہے ہوں، اور بغداد پہنچنے کے بعد ہی علم حاصل کیا ہو نیز یہ بھی ممکن ہے کہ تحصیل علم کے بعد بھی اس آبائی پیشہ کو ذریعہ معاش بنائے رکھا ہو کیونکہ گزر چکا کہ حکومت سے باوجود خواہش کے بے تعلق رہے۔

بہر حال امام الہدیٰ کے بعد حنفی اصول فقہ میں جیسا کہ میرا خیال ہے یہ دوسرے صاحب کتاب ہیں۔ اگرچہ الجصاص امام الہدیٰ کی زندگی میں نوجوان کیا بلکہ کافی جوانی کی منزل طے کر چکے تھے لیکن ان کو امام الہدیٰ سے شخصاً استفادہ کا موقع غالباً نہیں ملا کیونکہ جب تک وے یہیں رہے یہاں سے سمرقند جا سکتے تھے تحصیل علم میں مشغول نہیں ہوئے تھے بغداد آنے کے بعد جیسا کہ گزر چکا امام ابو الحسن الکرخی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، واللہ اعلم پھر کیا صورت پیش آئی کہ اپنے استاد الکرخی کے مشورہ سے یہ بغداد سے نیشاپور چلے گئے۔ الصیمری نے جو فقرہ لکھا ہے کہ

خرج الی نیسابور مع الحاکم النیشاپوری برأی شیخہ ابی الحسن الکرخی ومشورتہ (ص۸۵) — الحاکم نیشاپوری محدث کے ساتھ اپنے استاد ابو الحسن الکرخی کے مشورہ و رائے کے موافق نیشاپور گئے۔

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ فن حدیث کی تکمیل کے لیے الحاکم کے ساتھ اُستاد نے اُن کو جانے کا حکم دیا۔ کیونکہ اس وقت فن حدیث میں الحاکم ہی کا طوطی بول رہا تھا، الصیمری نے یہ بھی لکھا ہے کہ :-

فمات الکرخی وھو بہ نیسابور۔ — الکرخی کا انتقال ہوا جبکہ وہ (الجصاص) نیشاپور میں تھے۔

نیز یہ بھی اسی میں ہے کہ :-

ثم عاد الی بغداد سنۃ اربع واربعین وثلاث مائۃ (ص۸۵) — پھر ۳۴۴ ہجری میں بغداد میں واپس ہوئے

میں نے الجصاص اور الکرخی کے تعلقات کا یہ ذکر اس لیے ذرا زیادہ تفصیل سے کیا کہ الکرخی کی تالیفات کی فہرست میں تو تذکرہ نہیں کیا جاتا لیکن کچھ دن ہوئے الکرخی کے نام سے دو ورق کا ایک رسالہ ہندوستان میں شائع ہوا ہے جس پر یہ لکھا ہوا ہے۔

الاصول اللتی علیھا مدار کتب اصحابنا — [illegible] جن پر ہمارے اصحاب (ائمہ احناف) کی کتابوں کا

---

[۱] غالباً مقام ولادت کے اس اشتباہ ہی نے بعضوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا کہ ابو بکر رازی اور جصاص دو الگ الگ شخصیتیں ہیں عبد القادر المصری نے لکھا ہے "ان شخصا من الحنفیۃ نازعنی غیر مرۃ فی ذلک وذکرت الجھل من غیرابی بکر الرازی (ص۸۴) مولانا عبد الحی نے فیروزآبادی صاحب قاموس کی طبقات حنفیہ سے نقل کیا ہے کہ بعضوں کو یہ وہم ہوا ہے مگر غلط ہے دونوں ایک ہی آدمی ہیں (فوائد ص[illegible])

من جهة الامام العلامه ابی الحسن الکرخی (ذیل تاسیس النظر مطبوعہ قاسمی دیوبند-)

دار و مدار ہی اور یہ اصول علامہ ابو الحسن الکرخی الامام کی طرف سے ہیں۔

واللہ اعلم "من جہۃ" کا کیا مطلب ہے کیا کسی دوسرے نے اُن سے سن کر ان اُصولی قواعد کو مرتب کر کے الکرخی کی طرف منسوب کیا ہے؟ زیادہ قرین قیاس یہی ہے یا یہ پھر اس کی تعبیر کہ الکرخی کی یہ تصنیف ہے، افسوس ہے کہ ناشر نے کچھ نہیں لکھا کہ یہ رسالہ ان کو کہاں ملا اور الکرخی کی طرف اس کا انتساب کس بنیاد پر وہ کرتے ہیں، میں نے بتایا کہ رسالہ دو ورق کے قریب ہے لیکن ناشر نے یہ لکھکر کہ:

ذکر شواهدها ونظائرها وامثالها الامام نجم الدین ابو حفص عمر ابن احمد النسفی

اس کے شواہد و نظائر اور امثال امام نجم الدین ابو حفص عمر بن احمد النسفی نے بیان کئے ہیں:-

الکرخی کے اصل رسالہ کے حجم کو اور بھی کم کر دیا، ان شواہد و نظائر و امثال کو خارج کر دینے کے بعد شاید ایک ورق بھی مشکل ہی سے ٹھیرے، شمار کرنے سے معلوم ہوا کہ چالیس کے قریب ان کلی قاعدوں کو اس میں جمع کیا گیا ہے جن پر حنفی امام کے اجتہاد کی بنیاد ہے، کوئی شبہ نہیں کہ حجماً یہ رسالہ جس قدر بھی صغیر معلوم ہوتا ہو لیکن قیمتاً بہت کبیر ہے خصوصاً النسفی کی تشریحات نے اس کو اور زیادہ قیمتی بنا دیا ہے اور اس سے الجصاص کی "کتاب الاصول" کی بنیاد کا بھی پتہ چلتا ہے کم از کم اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اصولی مذاق الجصاص میں اپنے استاد الکرخی ہی سے منتقل ہوا، پھر اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جب الجصاص اپنے استاد الکرخی کے اشارہ سے نیشاپور گئے تو خوش قسمتی سے نیشاپور میں بھی ان کو الکرخی کے ایک رشید تلمیذ ابو سہل الزجاجی سے استفادہ کا کافی موقعہ ملا۔ الزجاجی[1] کے تذکرہ میں لکھا ہے:-

درس علی ابن الحسن الکرخی ورجع الی نیشاپور فمات بها ودرس علیه ابو بکر الرازی وتفقه به فقهاء نیشاپور ص۲۵۳

ابو الحسن الکرخی کے یہاں شریک درس رہے؛ اور نیشاپور میں واپس ہوئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا ابو بکر الرازی (الجصاص) بھی اُن کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور ان سے نیشاپور کے فقہا نے علم فقہ حاصل کیا۔

جہاں تک قرائن کا اقتضا ہے الزجاجی پر بھی "جدلی" اور "اصولی مباحث" کا رنگ زیادہ غالب تھا۔ اسماعیل بن عباد کے حوالہ سے صیمری نے نقل کیا ہے۔

کان ابو سهل الزجاجی اذا دخل مجلس النظر تغیر وجوه المخالفین له لقوة نفسه وحسن جدله (الجواهر ص۲۵۳)

جب ابو سہل الزجاجی مجلس مناظرہ میں شریک ہوتے تو ان کی ذاتی قابلیت اور جدلی قوت کی وجہ سے مخالفین کے چہرے متغیر ہو جاتے (باقی)

[1] الزجاجی کے متعلق عجیب بات ہے کہ لوگ ان کو کبھی الغزالی کبھی الزجاجی لکھتے ہیں، الزجاجی کیوں کہتے تھے کیا زجاج (شیشہ) بنانے کا کام کرتے تھے؟ ابو اسحاق شیرازی کے "طبقات الفقہا" کے ایک قدیم نسخہ میں السمعانی نے "ز" کو پیش لگا ہوا پایا تھا اس سے غالب گمان ان کا یہی ہے کہ یہ شیشہ گر تھے (الجواہر ص۲۵۳)۔

اسی کے ساتھ نہیں اس کا بھی خیال کرنا چاہیئے کہ الجصاص کو فقہا یا اہل الرائے کے سوا اصحاب الاخبار والحدیث سے بھی استفادہ کا موقع ملا ہے، یہ تو بیان کیا جا چکا کہ اپنے استاد کے اشارہ سے وہ صاحب مستدرک الحاکم کے ساتھ نیشاپور گئے، علاوہ اس کے عبدالباقی بن قانع محدث کے متعلق بھی جواہر میں لکھا ہے کہ

روی الحدیث عن عبد الباقی بن قانع واکثر عنه فی احکام القرآن (ص۵۸)	الجصاص نے عبدالباقی بن قانع سے روایت حدیث کی اور اپنی تصنیف "احکام القرآن" میں بہت سی حدیثیں ان سے روایت کی ہیں۔

عبدالباقی بن قانع پر اگرچہ ائمہ رجال کو اعتراض ہے "لسان المیزان" میں ہے کہ

قال البرقانی فی حدیثه نکرة (ج ۳ ص۳۸۳)	البرقانی نے کہا کہ اُن (عبدالباقی بن قانع) کی حدیثوں میں ناآشنائی کی بو آتی ہے۔

لیکن الخطیب کی رائے ہے کہ

لا ادری لماذا ضعفه البرقانی فقد کان ابن قانع من اهل العلم والدرایة ورایت عامة شیوخنا یوثقونه وقد تغیر فی آخر عمره	میں نہیں جانتا کہ عبدالباقی بن قانع کو البرقانی نے ضعیف راویوں میں کیوں شمار کیا حالانکہ وہ اہل علم و درایت میں ہیں میں نے اپنے اکثر شیوخ کو دیکھا ہے کہ ان کی توثیق ہی کرتے تھے۔ لیکن ہاں آخری عمر میں تغیر پیدا ہو گیا۔ (حافظہ وغیرہ کے ضعف کی طرف اشارہ ہے)

نیز یہ بھی انہی نقد رجال والوں سے منقول ہے کہ:۔

روی عنه الاجلة ووثقوه بالحفظ منهم ابو الحسن الدارقطنی ودونه	بڑے بڑے لوگوں نے ان سے روایت کی ہے اور ان کے حافظہ کی توثیق کی ہے اور اُن توثیق کرنے والوں میں ابو الحسن الدارقطنی اور ان کے سوا اور لوگ بھی ہیں۔

حافظ ابن حجر نے بھی اپنا فیصلہ ان الفاظ میں درج کیا ہے :-

ما اعلم احداً ترکہ وانما صح انہ اختلط	میں کسی کو نہیں جانتا کہ اُس نے ان کی روایت کو ترک کر دیا ہو البتہ صحیح ہے کہ آخر عمر میں کچھ اختلاط پیدا ہو گیا تھا۔

بظاہر عبدالباقی پر حافظ کی جرح کی وجہ ان کا یہی اختلاط ہے، لیکن ابن حزم جو بجائے تعدیل کے جرح کے امام ہیں اور اس لئے حافظ عبدالباقی کی شان میں بھی حسب دستور سخت وسست الفاظ ان کے قلم سے نکل پڑے ہیں انہی کی تحقیق یہ ہے جیسا کہ حافظ نے لکھا ہے :-

قال ابن حزم اختلط ابن قانع قبل موتہ بسنۃ (لسان المیزان ص۳۸۳)	ابن حزم کا بیان ہے کہ ابن قانع میں یہ اختلاط کی کیفیت مرنے سے ایک سال پہلے پیدا ہو گئی تھی۔

اب جبکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ حافظ عبدالباقی کی وفات ۳۵۲ھ ہجری میں ہوئی ہے (حافظ ابن حجر نے اسی تاریخ کے متعلق "ہو الراجح" لکھا ہے) اور جب کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ الجصاص کا بغداد میں پہلا داخلہ ۳۲۵ھ میں ہوا اور نیشا پور سے واپسی بھی بغداد میں ۳۴۴ھ میں ہوئی تو دونوں صورتوں میں ۳۵۱ھ سے پہلے ہی الجصاص بغداد پہونچ گئے ہیں اس لیے ان کا شمار حافظ ابن قانع کے ان شاگردوں میں ہونا چاہیئے جنہوں نے اختلاط سے پہلے اُن سے حدیث حاصل کی خصوصاً جب کہ یہ بھی گذر چکا ہے کہ دوسری دفعہ نیشا پور سے جب بغداد پہونچے تو ان کے اُستاد الکرخی کی گدی ان کی وفات کی وجہ سے خالی ہو چکی تھی اور بقول الخطیب :-

استقر التدریس ببغداد لابی بکر الرازی وانتھت الرحلۃ الیہ۔	ابوبکر الرازی کا حلقۂ درس بغداد میں قائم ہو گیا اور "الرحلۃ" یعنی اہل علم کے علمی سفروں کی انتہا ان ہی کی ذات پر ہونے لگی۔

اس لیئے غالب قرینہ یہی ہے کہ حافظ عبدالباقی سے اُن کے حدیث سننے کا زمانہ اختلاط سے کافی پہلے ہے۔ آخر اختلاط کے بعد ... کہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے۔

اختلط فتجنبوہ	اُن کی روایتوں میں خلط ملط ہونے لگا اس لیئے

	لوگ ان سے پرہیز کرنے لگے۔

توجیسا کہ ابن قانع کے دوسرے شاگردوں نے چھوڑا ہوگا کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ الجصاص بھی انہیں متجنبین میں نہ ہوں۔

اسی سلسلہ کی ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ مولینا عبد الحی فرنگی محلی نے الجصاص کے ترجمہ میں علامہ زرقانی کی شرح مواہب سے یہ عجیب فقرہ نقل کیا ہے۔

ابو بکر الرازی احمد بن علی بن حسین الامام الحافظ المحدث النیسابوری من ائمة الحنفیة سمع اباحاتم وعثمان الدارمی وعنه ابو علی وابو احمد الحاکم	ابو بکر الرازی احمد بن علی بن حسین الامام الحافظ المحدث نیشاپوری حنفی ائمہ میں سے ہیں اور انہوں نے ابو حاتم اور عثمان دارمی سے حدیثیں سنی ہیں اور ان سے ابو علی اور ابو احمد الحاکم نے روایت کی ہے۔

(فوائد بهيه)

واللہ اعلم بالصواب الزرقانی نے جصاص کے متعلق یہ معلومات کہاں سے نقل کئے ہیں، شک میں جو بات ڈالتی ہے وہ سنِ وفات ہے کیونکہ اس کے بعد لکھا ہے۔

مات سنة خمس عشرة وثلث مائة۔	۳۱۵ھ میں وفات ہوئی۔

حالانکہ عام مورخین الجصاص کی وفات کا سن ۳۷۰ھ قرار دیتے ہیں اور زرقانی پورے پچپن سال پہلے بتاتے ہیں، پس اگر جصاص کی ولادت کا سال ۳۰۵ھ ہی مانا جاوے (جو عام کتابوں میں لکھا ہے) تو پھر ان کی عمر کل دس سال کی ٹھہرتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو شبہ ہوتا ہے کہ زرقانی نے جس شخص کا تذکرہ یہاں کیا ہے یہ الجصاص نہیں بلکہ کوئی اور ابو بکر رازی ہیں، نیز "محدث نیشاپوری" کے الفاظ سے بھی ان کی شہرت نہیں ہے، اگرچہ ان کا نیشاپور جانا ثابت ہے، لیکن میں بیان کرچکا ہوں کہ نیشاپور میں ان کا قیام تعلّم کے لیے تھا نہ کہ تعلیم کے لیے۔ تعلیم کا بازار تو ادھوں نے بغداد میں آکر گرم کیا۔

بہرحال اگر وفات کے سنہ میں زرقانی کی غلطی یا ناسخ کی غلطی مان لی جائے اور یہ بھی تسلیم کرلیے

جائے (جیساکہ مولانا عبدالحی نے تسلیم کیا ہے) کہ یہ جصاص ہی کا تذکرہ ہے تو پھر ان کی محدثیت کا درجہ اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے کہ ابو حاتم اور عثمان دارمی سے بھی ان کا تلمذ فی الحدیث اس روایت کی بنیاد پر ثابت ہوتا ہے۔

میری غرض ان معلومات کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ کچھ بھی ہو الجصاص کا شمار اُن ائمہ احناف میں ہے جن پر فقہ کے ساتھ محدثین کا رنگ بھی چڑھا ہوا تھا جس کی شہادت کے لیے ان کی مطبوعہ کتاب "احکام القرآن" کافی ہے، ایسی صورت میں یہ خیال گذرتا ہے کہ اصول فقہ میں ان کی کتاب جو میرے حساب سے طبقۂ حنفیہ کی اس فن میں الماتریدی کی دونوں کتابوں کے بعد تیسری کتاب ہے، دونوں رنگوں کو اپنے اندر لیئے ہوئے ہوگی، لیکن افسوس کہ زمانے کے ظالم ہاتھوں نے جس طرح امام الہدیٰ کی کتابوں سے ہمیں محروم کر دیا، جصاص کی اس کتاب کا بھی نام و نشان کم از کم میرے علم کی حد تک باقی نہیں ہے۔

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جصاص کے متعلق وہ رائے نقل کر دی جائے جو مولینا عبدالحی مرحوم نے بعض مولویوں (ابن کمال پاشا ترکی) کے رد میں ظاہر فرمائی "فوائد بہیہ" کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:-

من تتبع تصانيفه والاقوال المنقولة عنه علم ان الذين عدهم من المجتهدين كشمس الائمة وغيره كلهم عيال عليه فهو احق ان يجعل من المجتهدين فى المذهب۔ (حاشيه فوائد بهية ص۲۸)

جس نے الجصاص کی تصانیف کا اور ان قول کا تتبع کیا ہے جو ان سے منقول ہیں وہ جانتا ہے کہ جن لوگوں کو مجتہدین میں شمار کیا گیا ہے جیسے شمس الائمہ وغیرہ تو یہ سب کے سب ان کے خوشہ چین ہیں لہذا الجصاص اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو مجتہد فی المذہب مانا جائے۔

اِس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ الجصاص کی یہ کتاب اصول کی کیسی کتاب ہوگی۔

ابو زید دبوسی اور ان کی کتاب "تقویم الادلہ" و "تاسیس النظر"

عجیب بات ہے کہ فن اصول فقہ کی ابتدا جیساکہ گذر چکا۔ شافعیوں کے امام رحمہ اللہ نے فرمائی۔ اس کے بعد اہل الحدیث

اور ان کے ساتھ معتزلہ اس میدان میں کود پڑے، حنفیہ گویا سب سے آخر میں آئے۔ لیکن جن کتابوں نے اس فن میں شہرت حاصل کی اور تاریخوں میں جن کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ "الرسالہ" کے بعد ان ہی حنفی علماء کی کتابیں ہیں، الماتریدی اور الجصاص یہ دونوں بھی حنفی ہیں، الجصاص کی وفات سنہ ۳۷۰ھ میں چوتھی صدی کے نصف آخر میں ہوئی، اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ ان کی کتاب کے بعد اس فن میں جس کتاب کا نام امتیاز کے ساتھ لیا جاتا ہے وہ بھی ایک حنفی عالم ہی کی ہے، میرا اشارہ مشہور حنفی امام علامہ ابو زید دبوسی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ہے، ان کا عبید اللہ نام ہے، والد کا نام عمر ہے "دبوسہ" بخارا اور سمرقند کے درمیان ایک شہر کا نام ہے، اس کی طرف آپ کی نسبت ہے وفات سنہ ۴۳۰ھ میں بمقام بخارا ہوئی۔" جواہر مضیہ میں لکھا ہے کہ:- "وھو ابن ثلاث وستین سنة" (یعنی ۶۳ سال عمر پائی) جس کا مطلب یہی ہوا کہ ۳۶۷ھ میں ولادت ہوئی۔ گویا الجصاص کی وفات کے وقت علامہ دبوسی چار سال کے تھے۔ جہاں تک ان کے حالات علم میں آئے ہیں ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصول علم کی راہ میں اپنے وطن سے باہر یعنی عراق یا عرب و شام وغیرہ اسلامی ممالک نہیں گئے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ خود ان کے وطن ہی کے حدود میں "اُسروشنہ"[1] نامی جو شہر دریائے سیحون کے اسی پار سمرقند کے آگے کچھ فاصلہ پر تھا۔ اسی "اسروشنہ" میں ایک جلیل القدر ہستی امام ابو جعفر اسروشنی کی موجود تھی، امام ابو جعفر اسروشنہ کے قاضی بھی تھے اور تعلیم کا بازار بھی وادیٔ سیحون میں گرم کئے ہوئے تھے قاضی ابو زید انہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جہاں تک قیاس کا اقتضاء ہے اول سے آخر تک ان کی تعلیم ابو جعفر الامام الاسروشنی ہی کی خدمت میں پوری ہوئی۔ جس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ امام ابو زید کے اساتذہ کے سلسلہ میں ابو جعفر کے سوا مورخین اور کسی کا ذکر نہیں کرتے، دوسری بات یہ بھی ہے کہ ابو جعفر اسروشنی کا ذکر جہاں کہیں بھی جس مورخ نے کیا ہے ...... تو امام

---

[1] سمعانی وغیرہ نے لکھا ہے "بلدة کبیرة وراء سمرقند دون سیحون" تلفظ اس کا دو طرح کیا جاتا ہے۔ ایک وہی جو میں نے لکھا ہے البتہ "الف" کو پیش کے ساتھ پڑھنا چاہیئے بعض لوگ "استروشنہ" بھی لکھتے ہیں یعنی "سین" کے بعد تاء کا اضافہ کرتے ہیں سمعانی نے لکھا ہے "والصحیح ھو الاول" (فوائد بہیہ)

ابو زید کے استاذ ہونے کی حیثیت ہی سے روشناس کراتا ہے، مثلاً "جواہر مضیہ" میں الاسروشنی کے تذکرہ کو صرف ان الفاظ پر ختم کر دیا گیا ہے۔

ابو جعفر بن عبد اللہ الاسروشنی القاضی الامام استاذ ابو زید الدبوسی (ص ۲۲۲)	قاضی امام ابو جعفر بن عبد اللہ اسروشنی ابوزید دبوسی کے استاذ ہیں

"فوائد بہیہ" میں بھی الاسروشنی کے ترجمہ میں یہی لکھا ہے کہ:۔

تفقہ علیہ ابو زید الدبوسی صاحب الاسرار۔	ابوزید دبوسی صاحب الاسرار نے ان اسروشنی سے فقہ حاصل کیا۔

گویا الاسروشنی کا سب سے بڑا پتہ یہی ہے کہ وہ الدبوسی کے اُستاذ ہیں، ظاہر ہے کہ اگر کوئی خاص خصوصیت ابو زید کو ان سے نہ ہوتی تو یہ طریقہ عموماً نہیں اختیار کیا جاتا بہر حال میں یہی سمجھتا ہوں کہ عام طور پر اُس زمانہ میں بھی اور اب بھی ایک ہی آدمی مختلف اساتذہ سے جو تعلیم حاصل کرتا ہے الدبوسی کا یہ حال نہیں ہے۔ کم از کم اعلیٰ تعلیم ان کی بالکلیہ ابو جعفر ہی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ ممکن ہے کہ اس کے اسباب و وجوہ کچھ اور بھی ہوں لیکن بظاہر جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ عموماً اس زمانہ کے علما و خصوصاً ان علاقوں یعنی خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ کے علماء کا یہ حال تھا کہ جس کو فقہ سے دلچسپی ہوتی تھی وہ حدیث کی طرف کم توجہ کرتا تھا، حدیث کا جو ذخیرہ ان کے پاس ہوتا بھی تھا تو وہ انہی الفاظ میں جن الفاظ میں کہ فقہ کے اپنے اساتذہ سے وہ سنتے تھے، حتیٰ کہ بے خوف و خطر اپنی کتابوں میں بھی فقہ کے ان ہی اساتذہ کی زبانی سُنے ہوئے الفاظ وہ درج کرتے تھے، یہی معاملہ ہے جو آج تک بھی بہتوں کے لئے غلط فہمی کا سبب بنا ہوا ہے[ا]۔ اور یہی حال کچھ ان لوگوں کا تھا جو فن حدیث میں مہارت رکھتے

[ا] میرا مطلب یہ ہے کہ فقہ کی بعض کتابوں (مثلاً "ہدایہ") میں عموماً حدیثیں جن الفاظ میں پائی جاتی ہیں ان کو دیکھکر لوگ بھڑکتے ہیں، جس کو شارح ہدایہ نے "غریب جداً" اور "نادر جداً" کے الفاظ لکھدیئے ہیں، حالانکہ اگر الفاظ سے قطع نظر کر لیا جائے اور مفاد و مقصد پر نظر رکھی جائے تو ہدایہ کی عموماً اُن حدیثوں کو دوسرے الفاظ میں صحاح

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

تھے کہ فقہی جزئیات سے ان کو زیادہ دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ خود امام بخاری حدیثوں سے جس قسم کے فقہی جزئیات استنباط کرتے ہیں ایک فقیہہ کو کبھی کبھی بجائے قیاس فقہی کے اس پر قیاس شعری کا گمان ہوتا ہے اگرچہ ذہانت سے وہ استنباطات بھی خالی نہیں ہوتے۔

بہرحال اُس دور میں عام اہل کمال کا یہی حال تھا، اس لیے طلبہ کو مختلف علوم و فنون سیکھنے کے لیے ہر فن کے ماہرین کے پاس سفر کر کر کے جانا پڑتا تھا۔ لیکن علامہ ابو زید دبوسی نے جس زمانے میں آنکھ کھولی تو اپنے ملک کے ہم سرحد علاقوں میں ان کو ایسے اُستاد کا آستانہ مل گیا جس میں فقہ کے ساتھ ساتھ حدیث کا رنگ بھی پایا جاتا تھا یعنی وہی ابو جعفر اسروشنی رحمۃ اللہ علیہ کہ ایک طرف تو اسروشنی کا سلسلۂ تلمذ امام محمد بن حسن دست گرفتہ امام ابو حفص الکبیر البخاری سے مل جاتا ہے یعنی کل تین واسطوں سے الاسروشنی ابو حفص الکبیر کے شاگرد ہیں فوائد بہیہ میں ہے۔

الاسروشنی نفقه علی ابی بکر محمد بن الفضل عن عبداللّٰہ	الاسروشنی نے علم فقہ ابو بکر محمد بن الفضل سے حاصل کیا انھوں نے عبداللہ سبذمونی سے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) کی عام کتابوں ہی سے نکال کر دکھایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محدثین جب روایت بالمعنی کو صرف جائز ہی نہیں سمجھتے بلکہ زیادہ تر حدیثوں کا ذخیرہ روایت بالمعنی ہی کی حیثیت رکھتا ہے اور خود صحابہ بھی الفاظ کی پابندی چنداں نہ کرتے تھے۔ مطلب سب کا ایک ہوتا تھا الفاظ مختلف ہو جاتے تھے۔ تو ایسی صورت میں اگر ان ہی حدیثوں کو جنہیں ارباب حدیث اپنے الفاظ میں اپنی کتابوں میں درج کرتے تھے فقہاء انہی کو بجائے ان کے متردد الفاظ کے دوسرے الفاظ میں انہی معنی کو ادا کرتے تھے۔ جو محدثین کی روایت کردہ حدیثوں کا مفاد ہے تو اس پر غرابت اور اعجوبیت کا حکم کیوں لگایا جاتا ہے۔ (افادہ الاستاذ مولنا مناظر احسن گیلانی)

لہ حتیٰ کہ ایک طرف اگر محدثین نے فقہاء کی تعبیروں پر مسلسل غرابت و ندرت کا الزام لگایا تو دوسری طرف فقہ کے دائروں میں ان بیچارے محدثین کے متعلق عجیب و غریب لطائف فقہی مسائل کے متعلق مشہور تھے۔ مثلاً بعض فقہی کتابوں میں اور نوادر امام بخاری رحمۃ اللہ کے متعلق لکھ دیا گیا ہے کہ ابو حفص کبیر کے زمانہ میں ان سے مسئلہ پوچھا گیا کہ ایک بکری کا دودھ اگر کسی لڑکی اور لڑکے نے پیا ہو تو ان میں رضاعت کی حرمت کیا ثابت ہوگی؟ تو بولے کہ ہاں

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

السبذموني عن ابی عبد اللہ ابی حفص الصغیر عن ابی حفص الکبیر عن محمد بن الحسن الشیبانی۔	اور انھوں نے ابو عبد اللہ ابو حفص الصغیر سے اور انہوں نے ابو حفص الکبیر سے اور انہوں نے امام محمد بن الحسن الشیبانی سے

فقہ میں جو کمال بھی اس ذریعہ سے حاصل ہو سکتا تھا اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے جیسا کہ اسی کتاب "فوئد بہیہ" میں ہے کہ :-

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) لکھتے ہیں کہ ابو حفص نے اس بنیاد پر ان کو فتوی دینے سے منع کر دیا۔ لیکن میرے خیال میں یہ صرف ایک طبقاتی لطیفہ ہے۔ امام بخاری کی دقت نظر ان کی کتاب سے جو معلوم ہوتی ہے وہ بہت بلند ہے۔ ۱۲ الاستاذ الگیلانی۔

لے الاسروشنی کے استاذ محمد بن فضل تاریخوں اور کتابوں میں الکماری البخاری کے نام سے مشہور ہیں کمارا بخارا میں ایک گاؤں کا نام تھا۔ فقہ کی کتابوں میں بکثرت ان کے فتووں کا ذکر آتا ہے کہتے ہیں کہ مبسوط امام محمد کی ان کو زبانی یاد تھی۔ ان کے استاذ عبد اللہ السبذمونی فقہ حنفی میں الاستاذ ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے السبذمونی کو من اہل الوجوہ و اصحاب التخریج (الانصاف) قرار دیا ہے محدثین مثلاً الحاکم، الخطیب اور ائمہ فقہ مثلاً ابو زرعہ رازی وغیرہ نے بھی اپنی کتابوں میں ان کا ذکر کیا ہے مگر وہی بات کہ محدثین کے الفاظ میں چونکہ یہ حدیثوں کی روایت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے اساتذہ فقہ کی تعبیروں میں اس مفہوم کو ادا کرتے تھے۔ اس لئے ان تمام حدیث و رجال کے بزرگوں نے ان بیچارے کے متعلق " له عجائب وغرائب و مناکیر "یا" افرد عن الثقات " اور " سکتوا عنہ " وغیرہ لکھا ہوا ہے ناواقف سمجھتے ہیں کہ واقع میں ان کی حدیثیں بے سرو پا ہوتی تھیں، حالانکہ محدثین اور ائمہ رجال کا قاعدہ ہے کہ جن حدیثوں کو اپنے مقررہ الفاظ میں نہیں پاتے اپنے دستور کے مطابق ان کو عجائب وغرائب کہہ دیتے ہیں۔ یہی بات اب تک ہدایہ کی حدیثوں میں برتی چلی جا رہی ہے۔

ایک اور بات بھی اس سلسلہ میں شاید قابل ذکر ہو اور اس سے بھی ان الجھنوں کے سمجھنے میں کچھ روشنی مل سکے۔ تفصیل کا تو موقع نہیں مختصر یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو آخر زندگی میں بخارا سے جو نکلنا پڑا اور قصبہ خرتنگ میں بحالت نظر بندی جو وفات پائی تو اس میں لوگ جہاں بخاری کے استاذ محمد بن یحیٰ ذہلی کی عمر کا بیہ

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اخذ عن ابی بکر الجصاص الرازی (ص ۲۷)	الاسروشنی نے ابوبکر الجصاص الرازی سے بھی علم حاصل کیا۔

جصاص رازی کے متعلق گذرچکا کہ فقہ کے ساتھ ساتھ اونھوں نے وقت کے ائمہ حدیث سے بھی استفادہ کیا تھا اس لیے اُن کی تصنیفات کا رنگ عام فقہا کی کتابوں سے الگ ہے یعنی جن حدیثوں کا استعمال اپنی کتابوں میں وہ کرتے ہیں اُن کے الفاظ عموماً محدثین ہی کے ہوتے ہیں۔ "احکام القرآن" ہی کے دیکھنے سے بہ اوّل نظر اُس کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسروشنہ میں گھر کے پاس ہی جب امام ابوزید کو اس جامعیت کا استاذ مل گیا تھا جو ایک طرف ابوحفص کے سلسلے فقہ کا امام تھا تو دوسری طرف الجصاص کی صحبت میں محدثانہ رنگ بھی ان پر چڑھا ہوا تھا تو یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ الدبوسی کو ماوراء النہر اور اُس کے نواح سے باہر تحصیل علم کے لئے نہ جانا پڑا۔

اسی کے ساتھ الجصاص جو میری تحقیق کی روسے حنفی اصول فقہ کے مصنفوں میں دوسرے آدمی ہیں جب ان کے شاگرد ابوجعفر اسروشنی سے الدبوسی نے تعلیم پائی تھی تو اصول کے ساتھ ان کے تعلق کی وجہ بھی ظاہر ہوجاتی ہے۔

الدبوسی کی تصنیفات | بہرحال الدبوسی جب خود افادہ کی مسند پر بیٹھے تو پڑھنے پڑھانے کے مشغلہ کے ساتھ قلم بھی اُنھوں نے ہاتھ میں لیا، چونکہ جامع اُستاد کی صحبت میں ان میں بھی جامعیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس لیئے جو کتابیں اُنھوں نے لکھیں وہ حنفی مکتبِ خیال کے عام مصنفوں کے مقابلہ میں خاص امتیاز رکھتی ہیں، ان کی سب سے زیادہ مشہور کتاب تو

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) کو سبب قرار دیتے ہیں کہ مسئلہ "خلق قرآن" میں امام بخاری سے وہ ناراض ہوگئے اور امیر بخارا خالد کو لکھا کہ "بخارا سے انہیں الگ کردو تو اس سلسلہ میں اسبذمونی کے استاذ الاستاذ ابوحفص الکبیر ہاتھ بھی بٹاتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ طبقاتی قصے آگے نہ بڑھے ہوں اور الاستاذ السبذمونی سے متعلق محدثین کے ان الفاظ میں ان اندرونی کشیدگیوں کو بھی دخل نہ ہو خصوصاً نقلی حیثیت سے محدثین کی تنقید غلط بھی نہ تھی۔

السبذمونی یہ قریہ سبذمون کی طرف نسبت ہے۔ بخارا سے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر یہ گاؤں تھا۔

"اسرار الفقہ" ہے۔ حاجی خلیفہ نے "اسرار فی الاصول والفروع" اس کا نام بتایا ہے۔ لکھا ہے "ہوفی مجلد کبیر"۔ اس کتاب کا پایہ کتنا بلند ہے؟ اس کا اندازہ بھی اس سے ہو سکتا ہے کہ مشہور مالکی امام علامہ ابن العربی[1] المعافری صاحب "احکام القرآن" کی کتاب "سراج المریدین" کے حوالے سے صاحب "جواہر مضیہ" نے ایک موقعہ پر اسی "کتاب الاسرار" کے متعلق لکھا ہے کہ ابن العربی کہتے ہیں کہ مشرق سے پڑھ کر جب میں پھر مغربی ممالک کی طرف واپس ہوا تو فاس اور تلمسان میں اس کتاب کی یعنی کتاب[2] الاسرار دبوسی کی عبارتیں لوگوں کو سناتا تو ان کو حیرت ہوتی، لیکن میرے پاس وہ نہیں تھی آخر ایک شوقین طالب علم محض کتاب کے حاصل کرنے کے لئے مغرب سے روانہ ہو کر مشرق پہنچا لکھا ہے کہ

فرحل الی العراق وکتبها من المدرسة الحنفیه بمدینة السلام وجائبها۔	اس نے عراق کا سفر کیا اور اس کتاب کو مدینۃ السلام یعنی بغداد کے ایک حنفی مدرسہ سے نقل کیا اور اس کا وہ نسخہ لے کر مغرب واپس آیا۔

ابوبکر بن العربی نے اس کے بعد لکھا ہے۔

وکان ذالك من جمیل صنع اللہ معی	اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ یہ بڑا فضل کیا ہے۔

---

[1] امام غزالی کے ارشد تلامذہ میں، احکام القرآن اور ترمذی کی شرح ان کی چھپ چکی ہے اور القواصم والعواصم نامی کتاب ان کی مطبوعہ ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے بستان المحدثین لکھا ہے کہ ان کی تفسیر انوار الفجر اسی ہزار ۸۰۰۰۰ اوراق میں ہے، اندلس کے رہنے والے، مشرق سے پڑھنے کے بعد مغرب میں درس و تدریس تالیف و تصنیف کا بازار گرم کیا۔

[2] چند سال ہوئے ہماری جامعہ میں ایک امیر نے اپنا کتب خانہ وقف کیا۔ اس میں "الاسرار" کا ایک بہترین نسخہ بھی جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے کی ملکیت میں آگیا ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۃً حنفی فقہ میں اس جوڑ کی کتاب خصوصاً استدلالی حیثیت سے بمشکل کوئی دوسری نکل سکتی ہے۔ ۱۲۔

الاستاذ الگیلانی۔

اس سے اگر ایک طرف اس زمانہ کے تشنہ کامان علم کا حال معلوم ہوتا ہے تو دوسری طرف الدبوسی کی اس کتاب کی منزلت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خود ابوبکر ابن العربی اپنے وقت کے امام ہیں، ان کے یہ الفاظ کتاب الاسرار کے متعلق اپنے اندر جتنی قیمت رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

الدبوسی نے اس سلسلہ میں دوسری معرکۃ الآرا کتاب اصول فقہ میں لکھی ہے جس کا نام "تقویم الادلہ" ہے اور میرے نزدیک الجصاص کے بعد اصول فقہ میں انہیں کی یہ کتاب ہے طاش کبری زادہ نے بھی "مفتاح السعادہ" میں الجصاص کی کتاب "کتاب الاصول" کے بعد الدبوسی ہی کی کتاب کا ذکر کیا ہے، اگرچہ ان کے الفاظ کچھ مبہم سے ہیں یعنی اصول فقہ کی کتابوں کو گنواتے ہوئے لکھتے ہیں۔

منها کتاب الاسرار وکتاب تقویم الادلة والامد الاقصی کلاهما لابی زید الدبوسی (ج ۲ ص۵۴)	ان کتابوں میں کتاب الاسرار اور تقویم الادلہ، اور الامد الاقصیٰ بھی ہیں یہ سب ابوزید دبوسی کی تصنیفات ہیں۔

جس سے بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ یہ تینوں کتابیں الدبوسی کی اصول فقہ ہی میں ہیں، حالانکہ "کتاب الاسرار" تو فقہ کی ایک استدلالی کتاب ہے جیسے ہدایہ وغیرہ بلکہ اس کا طریقۂ تحریر قریب قریب وہی ہے جو علامہ ابن رشد مالکی کی کتاب "بدایۃ المجتہد" کا ہے اور جو ہمارے جامعہ کے نصاب ایم۔اے (فقہ) میں شریک ہے اور "الاسرار" کو توجیہ ایک گونہ اصول فقہ سے تعلق بھی ہو سکتا ہے۔ حاجی خلیفہ نے "فی الاصول والفروع" لکھا بھی ہے لیکن "الامد الاقصے" کو اصول فقہ بلکہ فقہ کے نیچے بھی کسی حیثیت سے درج نہیں کیا جا سکتا۔ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے۔

هو یشتمل علی حکم ونصائح فی احد عشر کتاباً (کشف الظنون ج ۱ ص۱۱۱)	وہ حکم و نصائح میں گیارہ کتابوں پر مشتمل ہے۔

البتہ "تقویم الادلہ" بلاشبہ اصول فقہ کی کتاب ہے اور مصر وقسطنطنیہ وغیرہ کے کتب خانوں کی فہرستوں میں متعدد مقامات پر اس کا نام ملتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ابھی خدا کے فضل سے اسلامی ممالک میں موجود ہے۔ ہندوستان کے کتب خانوں میں البتہ اب تک اس کا سراغ نہیں ملا ہے۔ اس کتاب کی بعد کو لوگوں نے شرحیں بھی لکھیں ہیں خصوصاً فخر الاسلام ابو الحسن البزدوی

کی شرح کے متعلق تو حاجی کا بیان ہے :-

هو شرح حسن اعتبره العلماء الحنفية (ص ۳۴۵)

وہ بہترین شرح ہے جس پر حنفی علماء نے اعتبار کیا۔

یوں بھی الدبوسی کے حالات جو کتابوں میں ہم پڑھتے ہیں ان سے بھی ان کی افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے السمعانی نے لکھا ہے :-

يضرب به المثل في النظر واستخراج الحجج

نظری قوتِ استخراج اور استدلال میں وہ ضرب المثل تھے۔

ایک اصولی کے لیے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی نظری خداداد قوت کس حد تک مفید ہو سکتی ہے اور اس کا اثر اس کی تالیف پر کتنا بڑا ہو گا، یہ بھی لکھا ہے کہ :-

وكان له بسمرقند وبخارا مناظرات مع الفحول

سمرقند اور بخارا میں انھوں نے بڑے بڑے علماء سے کئی مناظرے کئے۔[1]

اور سچ تو یہ ہے کہ فن اصول فقہ کی ایک مستقل شاخ جس کا نام "خلافیات" ہے بالاتفاق علوم اسلامی کے مورخین کا یہ بیان ہے کہ :-

وهو اول من وضع علم الخلاف وابرزه في الوجود (ابن خلکان وغیرہ)

سب سے پہلے انھوں نے ہی علم الخلاف کو وضع کیا اور اس کو معرضِ وجود میں لائے۔

تو پھر ان کا اس فن میں جو پایہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

مورخین مذکورۂ بالا منقولہ فقرہ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کی اس مجموعہ کتاب کی

---

[1] ابن خلکان نے الدبوسی کے متعلق اس سلسلہ میں یہ لطیفہ نقل کیا ہے کہ ایک فقیہ مدعی سے ان کا مناظرہ ہو رہا تھا جب الدبوسی اسے الزام دے کر چپ کر دیتے تو فقیہ مدعی ہنس پڑتا الدبوسی کو اس کی اس حرکت پر غصہ آگیا اور بے ساختہ یہ دو شعر ان کی زبان پر جاری ہوئے۔

مالي اذا الزمته حجة - قابلني بالضحك والقهقهه

وان كان ضحك المرء من فقهه - فالدب في الصحراء ما افقهه۔

طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا ذکر پہلے بھی اجمالاً آچکا ہے یعنی "تاسیس النظر" جو پہلے مصر سے شائع ہوئی پھر علمائے دیوبند نے ہندوستان میں بھی اس کو چھاپا ہے۔ تو جہاں تک اس کتاب کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے الدبوسی نے اصول فقہ کے ایک خاص حصّہ کو جواب تک شاید مخلوط شکلوں میں چلا آتا تھا الگ کر دیا، مقصد ان کا یہ ہے کہ ائمہ فقہ کے جو اختلافات جزئیات میں نظر آتے ہیں در اصل یہ جزئی اختلافات نہیں ہیں، بلکہ ہر امام کا ایک کلی نقطۂ نظر ہے اس کلیہ کے نیچے ان کے سارے تفریعی جزئیات مندرج ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ائمہ سے تو صرف مسائل و جزئیات ہی منقول ہیں، الدبوسی کا یہ کمال ہو کہ انہیں جزئیات کا تتبع کرکر ہر امام کے جزئیات کو اُنھوں نے کلیات کی طرف راجع کر دیا۔

بہرحال قاضی ابو زید دبوسی نہ صرف اُصول فقہ کی کتابوں کے مصنفین میں حنفی فقہا کی حیثیت سے تیسرے آدمی ہیں بلکہ اس فن کی ایک مستقل شاخ کے موجد بھی ہیں۔ میرا مقالہ بہت طویل ہو جائے گا ورنہ امام دبوسی کے کارناموں پر ذرا تفصیلی بحث کرتا لیکن وہ تو خود ایک مستقل مقالہ کا عنوان ہے[1]

---

[1] ابن خلدون نے بھی "علم الخلافیات" کا ذکر کیا ہے لیکن اولیت کا جو فخر قاضی الدبوسی کو حاصل ہے شاید اس سے وہ واقف نہیں، بلکہ اُس نے علم کا فائدہ بتا کر یہ لکھتے ہوئے کہ "ہو علم جلیل الفائدہ" لکھا ہے کہ "کتب الحنفیہ والشافعیہ اکثر من تالیف المالکیۃ" اور پھر جیسا کہ ابن خلدون کا ایک خاص انداز ہے یعنی سب سے زیادہ وہ مغرب کے مسلمانوں پر جہاں بھی ممکن ہو سخت چوٹیں کرتا ہے، یہاں پر بھی نہیں چوکا۔ مالکیہ کی کتابیں اس فن میں کیوں کم ہیں؟ اس کی توجیہہ میں لکھتا ہے "لان اکثرھم اھل المغرب وھو بادیۃ" شاید دنیا کے مشہور آدمیوں میں یہی ایک شخص ہے جو اپنے ہم وطنوں پر غیروں سے زیادہ معترض ہے۔ عام مسلمانوں کے ساتھ بھی اس کا یہی حال ہے کہ ہمیشہ غیروں کو مسلمانوں پر ترجیح دینے کا عادی ہے، یوروپ والوں میں ابن خلدون کی جو پوجا ہوتی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے عجیب و غریب تاریخی فلسفہ کی وجہ سے ہوتی ہے، اصلی راز اس کا وہ ہاتھی ہوتا ہے جو اپنی فوج ہی کو روندتا ہے۔ یہی بات "کہ مغرب چونکہ بادیہ ہے اس لیے علم سے اس کو مناسبت نہیں"، کتنی غلط بات ہے، جس ملک کا حافظ ابو عمرو بن عبدالبر، بقی بن مخلد، ابن بطال، ابن عربی، تصوفی ابن العربی

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

الدبوسی کے بعد

پانچویں صدی کے تیسرے عشر یعنی سنہ ۴۳۰ھ میں قاضی ابو زید کا انتقال ہوا۔ اصول فقہ کے متعلق اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نئی راہ نکالنے والوں میں قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، لیکن اپنی اعلیٰ تصنیفات کے ساتھ خدا ہی جانتا ہے کیا وجہ ہوئی کہ قاضی صاحب کے تلامذہ میں کسی نے کوئی خاص شہرت حاصل نہ کی، حتیٰ کہ تاریخوں میں تو اس کا ذکر ہی نہیں پایا جاتا کہ ان کا معمولی یا غیر معمولی کوئی شاگرد تھا بھی یا نہیں لیکن قاضی کے استاذ الاستاذ محمد بن الفضل الکماری کے شاگرد قاضی حسین بن خضر جو ابو علی النسفی کے نام سے مشہور رہیں اور قاضی ابو زید کے ہم عصر ہیں ان کو (بخلاف قاضی ابو زید کے) بلاد ماوراء النہر کے سوا بغداد کوفہ۔ مکہ۔ رَے۔ ہمدان وغیرہ کے اُن فقہا اور محدثین کے حلقوں میں استفادہ کا موقع ملا تھا۔ جو اُس زمانے میں ان مرکزی مقامات کے مشہور اصحاب درس و افادہ میں تھے۔ علمی سفر سے واپسی کے بعد بخارا ہی میں درس و تدریس کی مسند اُنھوں نے بچھائی تھی۔

ان ہی قاضی ابو علی کے شاگردوں میں شمس الائمہ عبدالعزیز الامام جو الحلوائی[۱] کے نام سے علمی اور فقہی حلقوں میں مشہور رہیں اُن کے ایک نہیں بلکہ منجملہ دیگر کبار تلامذہ کے دو رشید شاگرد ۔۔۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) الفقہیہ، ابن بطوطہ، ابن رشد، ابن ماجہ، ابن زہر وغیرہ وغیرہ گذرے ہوں، کیا اس کو "بادیہ" اور "علمی روشنی سے ناآشنا علاقہ" کہنا صحیح ہو سکتا ہے؟۔ واضح رہے کہ اس موقع پر ابن خلدون نے الدبوسی کی کتاب کا نام بھی "التعلیقہ" غلط بتایا ہے۔ ۱۲۔ افادہ الاستاذ السید مولانا مناظر احسن الگیلانی۔

[۱] شمس الائمہ الحلوائی غالباً پہلے شخص ہیں جو شمس الائمہ کے لقب سے ملقب ہوئے ہیں، ان کے بعد دو شمس الائمہ تو خود ان کے دو شاگردوں کا لقب ہے ایک شمس الائمہ سرخسی اور دوسرے شمس الائمہ۔ زرنجری (زرنگری) ہیں۔

الحلوائی کی نسبت کے متعلق اگرچہ بعضوں کا خیال ہے کہ کسی قریہ کی نسبت ہے لیکن ارباب تحقیق نے بالاتفاق اس خیال کو رد کر دیا ہے۔ اسمعانی نے تصریح کی ہے کہ "الحلوائی بفتح الحاء نسبۃ الی عمل الحلوا وبیعہ" اب یہ بات کہ خود یہ شمس الائمہ مٹھائی بنا کر بیچا کرتے تھے اور یہی ان کی معاش کا ذریعہ تھا۔ میرے خیال میں اس زمانہ میں اہل علم کا حکومت کے ساتھ جو حال تھا اُس کے لحاظ سے یہ کچھ بعید نہیں ہے۔ نیز قضاء وغیرہ کی ملازمت کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس لیے غالب قرینہ ہے کہ یہ عمل خود امام کا تھا۔ البتہ الزرنوجی کی کتاب "تعلیم المتعلم" میں لکھا ہے کہ شمس الائمہ

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آیندہ)

نے قاضی ابوزید کے بعد فن اصول فقہ کی نمایاں خدمت کی جن میں، ایک صاحب تو شمس الائمہ سرخسی اور دوسرے اصول فقہ کے مشہور متداول متن البزدوی کے مصنف فخر الاسلام علی البزدوی رحمۃ اللہ علیہما ہیں۔

شمس الائمہ سرخسی | شمس الائمہ سرخسی ان کی مطبوعہ کتاب "مبسوط" (جو مصر سے تیس ضخیم جلدوں میں چند سال ہوئے شائع ہوچکی ہے) کی وجہ سے ہر خاص وعام ان سے واقف ہوچکا ہے ان کا نام محمد اور کنیت ابوبکر ہے سرخس کے رہنے والے تھے۔

اصولِ فقہ میں ان شمس الائمہ کی جو کتاب ہے حاجی خلیفہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

اصول الامام شمس الائمۃ محمد بن احمد السرخسی الحنفی المتوفی ثلاث وثمانین واربعمائۃ۔[له]	شمس الائمہ امام محمد بن احمد السرخسی الحنفی کی کتاب "اصول" ہے جن کا انتقال ۴۸۳ھ میں ہوا۔

(ص۔۹ کشف الظنون)

حاجی ہی نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

املاہ فی السجن بخوارزم فلما وصل الی باب الشروط حصل له	خوارزم میں بزمانہ قید اس کتاب کو لکھوایا جب شروط کے باب پر پہنچے تو جیل سے رہا

(بقیہ نوٹ صفحۂ گزشتہ) کے والد کا دستور تھا کہ علماء اور فقہاء کی خدمت میں مٹھائیاں پیش کرتے اور کہتے:۔ "ادعوا لابنی" (میرے بیٹے کے لئے دعا کرو) ہوسکتا ہے کہ شمس الائمہ نے اپنے والد کے اس پیشہ کو جاری رکھا ہو اس کی وجہ سے وہ الحلوائی کہلائے ہوں الحلوائی فقہ کے سوا حدیث کا بھی کافی ذوق رکھتے تھے۔ الانماطی الحبازی محمد بن احمد غنجاری الحافظ سے حدیث روایت کرتے تھے۔ طحاوی کی "معانی الاثار" کو بدو واسطہ خود امام طحاوی سے روایت کرتے تھے۔ ۴۴۸ھ میں وفات ہوئی۔ بعضوں نے ۴۵۶ھ بھی لکھا ہے۔

له۔ لیکن تعجب ہے کہ قاری نے اپنے طبقات میں السرخسی کی تاریخ وفات ۴۳۸ھ درج کی ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ قاضی ابوزید کی وفات کے کل آٹھ سال بعد شمس الائمہ کا انتقال ہوا اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو شمس الائمہ اور قاضی ابوزید باہم معاصر ہوجاتے ہیں لیکن صحیح تاریخ وہی ہے جو حاجی خلیفہ نے درج کی ہے۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

الفرج فخرج الی فرغانه فاکمل بها املاءه (ج ۱ ص ۹)

ہوئے اور وہ فرغانہ پہونچے اور لکھوا کر اس کی تکمیل کی

مدینۃ العلوم کے حوالہ سے مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے بھی نقل کیا ہے۔

له کتاب فی اصول الفقه وشرح السیر الکبیر املاهما وهو فی الجب محبوس بسبب کلمة نصح بها الامراء۔

”اصول فقہ میں ان کی ایک کتاب ہے اور ”شرح السیر الکبیر“ بھی انہیں کی کتاب ہے۔ ان دونوں کو انھوں نے کنویں کی قید کی حالت میں تصنیف کیا۔ حکامِ وقت کو نصیحت کی ایک بات کہنے کی پاداش میں وہ مقید کردیئے گئے تھے۔

یہ دراصل شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کے اُس مشہور قصے کی طرف اشارہ ہے جو ”کلمۃ حق عند السلطان الجائر“ کی تاریخ کا نمایاں واقعہ ہے، خود شمس الائمہ نے اپنی کتاب ”مبسوط“ کے مختلف مقامات پر اس کا تذکرہ کیا ہے خلاصہ اس کا مولانا عبدالحی کے الفاظ میں یہ ہے:

املأ المبسوط نحو خمس عشرة مجلداً وهو فی السجن باوزجند کان محبوساً فی الجب بسبب کلمة نصح بها الخاقان (ص ۱۶۴)

”المبسوط“ کو تقریباً پندرہ جلدوں میں اوزجند کے قید خانہ میں (طلبہ کو) لکھوایا جہاں وہ ایک کنویں میں محبوس تھے کیونکہ انہوں نے خاقان کو نصیحت کی تھی۔

بظاہر یہ جھگڑا اربابِ حکومت اور شمس الائمہ نور اللہ مرقدہ سے اس مشہور مسئلہ میں ہوا۔ جس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ فقہا اپنی کتابوں میں شمس الائمہؒ ہی کے حوالہ سے کرتے ہیں میری مراد ”مسئلۃ النوائب“ سے ہے۔ یعنی حکومت کی جانب سے بلاوجہ رعایا پر جو بھاری، بھاری ٹیکس اُس زمانے میں عائد ہونے لگے۔ جب خلافت بغداد کا پنجہ ڈھیلا ہوگیا تھا اور عام اسلامی ممالک خصوصاً خراسان، ماوراء النہر، ایران وغیرہ پر ترکمانی اور ترکی نومسلم جاہل

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) ”مدینۃ العلوم“ میں بھی لکھا ہے کہ ”مات فی حدود خمس مائة ۱۲

سرداروں کا قبضہ ہوگیا تھا اور وہ اپنے پرانے جاہلی دستور کے مطابق مختلف ناموں سے رعایا پر محصول عائد کرتے تھے فتح القدیر میں ہے۔

کالجبایات فی زماننا ببلاد فارس علی الخیاط والصباغ وغیرھم للسلطان فی کل یوم او الشھر او ثلاثۃ اشھر۔ (ھدایۃ مع شرحہ ج۵ ص۲۳۳)	جیسے ہمارے زمانہ میں ممالک فارس میں بادشاہ کے لئے درزی رنگریز وغیرہ پر یومیہ ماہواری یا سہ ماہی ٹیکس (دیا کرتے ہیں)

اس کے بعد ابن ہمام نے لکھا ہے:- کہ

قال شمس الائمۃ ھذا کان فی ذالک الزمان لانہ اعانۃ علی الجائحۃ والجھاد واما فی زماننا فاکثر النوائب توخذ ظلماً ومن تمکن من دفع الظلم عن نفسہ فھو خیر لہ۔	شمس الائمہ نے کہا کہ اس قسم کے ٹیکس اس زمانے میں رائج تھے کیونکہ اس پر مصیبت اور جہاد کے وقت اعانت ہوتی تھی۔ لیکن ہمارے زمانہ میں اکثر ٹیکس ظلماً ہی لئے جاتے ہیں اور جو شخص اپنی ذات سے ظلم دفع کرسکتا ہو اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ ایسا ہی کرے۔

اور شمس الائمہ کو صرف اسی پر اصرار نہ تھا بلکہ وہ کہتے تھے۔

وان اراد الاعطاء فلیعط من ھو عاجز عن دفع الظلم عن نفسہ او لفقیر لیستعین بہ الفقیر علی الظلم وینال المعطی الثواب (فتح القدیر ج۵ ص۲۳۳)	اگر کوئی شخص دینا ہی چاہتا ہے تو وہ ایسے شخص کو دے جو ظلم دفع کرنے سے عاجز ہے (مستحق امداد ہے) یا ایسے فقیر کو دے جو ظلم کے مقابلہ میں اس سے کچھ مدد لے سکے اور معطی ثواب پائے۔

جس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہوا کہ شمس الائمہ صرف حکومت کے ان ظالمانہ محصولوں کو ظلم ہی نہیں قرار دیتے تھے بلکہ مسلمانوں کو آمادہ کرتے تھے کہ خود بھی اس محصول کو ادا نہ کریں اور جو بیچارے

اتنی قوت نہ رکھتے ہوں کہ ظلم کا مقابلہ کرسکتے ہوں تو ارباب ثروت کو چاہیئے کہ اپنی پوری قوت سے ان کی مدد کریں تاکہ وہ ان ظالموں کا مقابلہ کرسکیں۔ جس کا خلاصہ یہی ہوا کہ وہ حکومت کے اس محصول کے مقابلہ میں تمام مسلمانوں کو ایک نقطہ پر مجتمع کر کے چاہتے تھے کہ اس ظلم کا ازالہ کیا جائے، اس مقابلے کے لیے چندہ جمع کرنے اور اس سرمایہ میں شریک ہونے والوں کیلئے ان کا فتویٰ تھا کہ اُخروی ثواب کے وہ مستحق ہوں گے۔

ظالم حکومتیں خصوصاً اُن ترکمانی سرداروں کی جو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے اِن آمدنیوں کو اپنا جائز حق سمجھتے تھے، ان پر شمس الائمہ کا یہ فتویٰ جو کچھ بھی اثر مرتب کرسکتا تھا وہ ظاہر ہے امام کو خوارزم کے رئیس نے صرف جیل کی سزا نہ دی بلکہ ایک "جب" یا کنویں میں اُن کو قید کیا، لیکن دین کے سرفروشوں کا حال سُنیئے کہ اس حال میں بھی کنویں کے اندر سے اِن طلبہ کو جو کنویں کے چاروں طرف بیٹھے رہتے تھے شمس الائمہ املاء کراتے تھے لکھا ہے:۔

كان يملام من خاطره من غير مطالعة كتاب وهو فى الجب واصحابه فى اعلى الجب (فوائد بهيه ص۱۵۲)	وہ اپنے دل سے بغیر کسی مطالعہ کتاب کے لکھواتے تھے جب وہ کنویں میں مقید تھے اور ان کے شاگرد کنویں پر ہوتے تھے۔

بظاہر حبس کی یہ مدت بہت طویل معلوم ہوتی ہے کیونکہ پوری مبسوط اور "مبسوط" کے ساتھ "سیر کبیر" کی شرح (جو حیدرآباد کے مطبع دائرۃ المعارف سے شائع ہوچکی ہے) نیز اصول فقہ کی کتاب ان سب کا اکثر حصّہ اِس قید کی زندگی ہی میں پورا ہوا ہے۔

مبسوط کے مختلف مقامات اور "سیر کبیر" دونوں کے بیچ بیچ میں شمس الائمہ نے اپنی اس حالت کا اظہار فرمایا ہے۔ عبدالقادر مصری نے "جواہر مضیہ" میں "مبسوط" کے چند جملے نقل بھی کئے ہیں۔ میں اسی سے نقل کرتا ہوں:۔

قال فى المبسوط عند فراغه من شرح العبادات هذا اخر شرح العبادات باوضح المعانى واوجز العبارات املاءه المحبوس عن الجمعة و	مبسوط میں عبادات کی شرح سے فارغ ہونے کے بعد علامہ نے لکھوایا ہے "عبادات کے باب کا یہ خاتمہ ہے، جس میں مسائل کو بہت واضح معانی کے ساتھ اور مختصر عبارت میں ادا

والجماعات......... وقال فی آخر کتاب الطلاق "هذا آخر کتاب الطلاق الموثر من المعانی الدقاق املاهٔ المحبوس عن الاطلاق المبتلی بوحشة الفراق مصلیاً علی صاحب البراق صلی الله علیه وعلی آله وصحبه اهل الخیر والسباق صلاة متضاعفة تلادم الی یوم التلاق۔

کیا گیا ہے، لکھوایا ہے اُس کو اُس شخص نے جو جمعہ اور جماعت کی شرکت سے روکا اور قید کیا گیا ہے (اسی طرح کتاب الطلاق کے آخر میں ہے)" یہہ کتاب الطلاق کا آخر ہے جس کے مسائل نہایت دقیق معانی سے حامل کئے گئے ہیں، لکھوایا ان مسائل کو اُس شخص نے جو چھوٹنے سے روکا گیا ہے (اور بال بچوں عزیزوں قریبوں) کے فراق وہجر میں مبتلا ہے اور صاحب البراق صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج رہا ہے۔ خدا اُن پر اُن کی اولاد پر اُن کے اصحاب پر اپنی رحمتیں نازل کرے جو نیکی والے لوگ تھے اور نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے، رحمتیں خدا کی اُس وقت تک نازل ہوں جب تک بندے خدا سے ملاقات کریں۔

اور بھی اسی طریقہ سے مختلف مقامات میں اس قسم کے فقرے املا کرتے چلے گئے ہیں، کتاب العتاق کے آخر میں ہے:۔

انتهی شرح العتاق من مسائل الخلاق والفراق املاہٗ المستقبل لمحن بالاعتناق حامدا للمهیمن الرزاق ومصلیاً علی جبیب الخلاق ومرتجیا الی لقائه بالاشواق وعلی آله وصحبه خیار الصحب والرفاق (ص۲۹۰)

"العتاق" کے باب کی شرح ختم ہوئی۔ لکھوایا ہے۔ اس کو اُس شخص نے جو خود ہی مشقتوں کے قبول کرنے کی طرف آگے بڑھا۔ اور اُس خدا کی حمد میں مصروف ہے جو ہر چیز پر حاوی ہے اور سب کو روزی پہنچانے والا ہے اور پروردگار آفریدگار کے دوست حبیب پر صلوٰۃ وسلام بھیج رہا ہے اور انتہائی شوق کے ساتھ اُن کی زیارت کا مشتاق ہے رحمتیں خدا کی نازل ہوں اُن پر اُن کے آل پر اصحاب پر اور رفقاء پر"

نہیں کہا جاسکتا کہ واقعی جیل کی یہہ مدت ٹھیک کیا تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی میں الپ ارسلان سلجوقی بادشاہ غازی کی تلوار جب مختلف بکھرے ہوئے اسلامی

ممالک (ایران، خراسان وعراق وغیرہ) کو ایک ہی مرکز حکومت کے قالب میں ڈھالنے میں کامیاب ہوگئی اور الپ ارسلان کے بعد اس کے بیٹے ملک شاہ سلجوقی "کہ از انطاکیہ تا آوز جند نہایات مملکت او بود" (روضۃ الصفا ص۱۰۱) اور پھر جیسا کہ لکھا ہے "بہ ہر شہر ولایتے حاکم عادل گماشت (ص۱۰۱)

بظاہر یہی زمانہ شمس الائمہ کی رہائی کا معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم شمس الائمہ کی تحریک کامیاب ہوئی یا خود حکومت نے اپنا طرز بدلا لکھا ہے کہ "رسوم محدثہ وعادات مذمومہ را برانداخت در زمان دولتِ او ہیچ مشہورے را مقدور آں نہ بود کہ بر فقیرے وضعیفے حیف کند" خصوصاً ناجائز محصولات پر پوری نگرانی سلطان کی طرف سے قائم ہوئی۔

ملک شاہ سلجوقی کے حالات میں ابن خلکان نے لکھا ہے :-

وابطل المکوس والخفارات فی جمیع البلاد (ج ۲ ص۱۳۳)	اس نے تمام ٹیکس اور محصول راہداری وچنگی تمام شہروں میں موقوف کرادیا۔

بہر حال کچھ بھی ہو جو شمس الائمہ کا مقصد تھا وہ تو پورا ہوگیا، اسی زمانہ میں اُن کو رہائی بھی ملی۔ رہا ہو کر یہ خوارزم سے فرغانہ چلے آئے یہاں کا امیر اس زمانے میں حسن نامی تھا اس نے شمس الائمہ کا بڑا احترام کیا اور "سیر کبیر" و اصول فقہ دونوں کتابوں کی تکمیل فرغانہ ہی میں کی مولینا عبدالحی نے لکھا ہے۔

فخرج فی آخر عمرہ الی فرغانہ فانزلہ الامیر حسن بمنزلہ ووصل الیہ الطلبۃ فاکمل الاملاء (ص۱۵۸)	وہ اپنی آخری عمر میں فرغانہ گئے امیر حسن نے اپنے محل میں آپ کو اُتارا اور پھر طلبہ آپ کے یہاں آنے لگے۔ اس لیے اُنھوں نے لکھوا کر کتابوں کی تکمیل کی۔

اصول الفقہ میں شمس الائمہ کی یہ کتاب کس نوعیت کی ہے اس کا صحیح اندازہ تو کتاب کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ میری رسائی اس کتاب تک نہیں ہے اگرچہ اس کے نسخے نایاب نہیں ہیں خود حیدرآباد کے کتب خانہ سعیدیہ میں بھی ایک نسخہ ہے لیکن میری نظر سے نہیں گزرا۔ بہرحال "مبسوط" اور "سیر کبیر" پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ان کا بیان کتنا

واضح اور صاف ہوتا ہے۔ غالب یہہ ہے کہ ان کا یہی رنگ اس کتاب میں بھی پایا جاتا ہوگا بخلاف ان کے دوسرے رفیق درس فخر الاسلام بزدوی کے جن کی کتاب کا حال ابھی آرہا ہے، قرآئن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کتاب اُن لوگوں سے ممتاز ہوگی جن پر صرف فقہ کا غلبہ ہوتا ہی بلکہ ابو بکر الجصاص کا جو طریقہ فقہا اور محدثین کے درمیان کچھ ملا جلا سا تھا، شمس الائمہ کی عام کتابوں میں بھی یہی کیفیت ہے اور اس لیے خیال ہوتا ہے کہ اصول فقہ کی اس کتاب میں بھی وہ اسی راہ پر چلے ہوں گے۔ کتابوں میں ان کے اصولی کتاب کے حوالہ سے جو چیزیں نقل کی جاتی ہیں ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ عبد القادر مصری نے "جواہر مضیہ" میں ایک جگہ لکھا ہے:-

قال الشیخ جلال الدین فی المغنی فی اصول الفقہ فی الکلام فی الحدیث المشہور، قال الجصاص انہ احد قسمی المتواتر وذکر شمس الائمہ ہذا القول فی اصولہ عن ابی بکر الرازی (ص۲۲۳)	شیخ جلال الدین نے مغنی میں اُصول فقہ کے بارے میں حدیث مشہور کے اختلاف کے ضمن میں کہا ہے کہ جصاص نے کہا کہ وہ متواتر کی قسموں میں سے ایک قسم ہے اور شمس الائمہ سرخسی نے بھی یہ قول اپنی کتاب "اُصول" میں ابو بکر رازی سے نقل کیا ہے۔

فخر الاسلام بزدوی جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں شمس الائمہ الحلوائیؒ کے چشمۂ علم سے سیراب ہونے والوں میں فخر الاسلام بزدوی بھی ہیں اور اس لیے شمس الائمہ سرخسی کے وہ ہم استاذ ہوئے، اُن کا اصلی نام علی اور والد کا نام محمد ہے۔ ماوراء النہر کے ضلع "نسف" میں ایک مشہور و مستحکم قلعہ "بزدہ" نامی تھا۔ ان کا مسقط الراس یہی قلعہ ہے۔ نسف سے بزدہ کے قلعہ کا فاصلہ کل سولہ میل ہے۔ فخر الاسلام خود بھی ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔
ان کے حقیقی دادا[1] عبد الکریم بن موسیٰ امام الہدیٰ ابو منصور الماتریدی کے تلامذہ میں تھے۔

---

[1] بعضوں نے عبد الکریم کو فخر الاسلام کے والد کا جد (پردادا) قرار دیا ہے لیکن مولینا عبد الحی نے بغوی کی "طبقات" سے نقل کیا ہے کہ "عبد الکریم امام الہدیٰ کے شاگرد فخر الاسلام کے دادا ہیں (فوائد ص۵۲)

جیسا کہ مشہور ہے اور عام کتابوں میں لکھا ہے۔ یہ دو بھائی تھے ایک تو یہی فخر الاسلام علی بن محمد ہیں اور اُن کے چھوٹے بھائی کا نام محمد بن محمد تھا۔ خدا کا فضل اس گھرانے پر تھا کہ دونوں بھائی اپنے وقت کے امام ہوئے۔ جیسے فخر الاسلام اِن کا لقب تھا۔ دوسرے بھائی صدر الاسلام کے لقب سے ملقب تھے۔

ان دونوں بزرگوں کے جد امجد علامہ عبدالکریم صرف یہی نہیں کہ امام الہدیٰ کے فیض یافتوں میں تھے بلکہ اپنے وقت کے درس وتدریس کا حلقہ بھی اونھوں نے قائم کیا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوتوں کو خود ان سے براہ راست استفادہ کا موقع نہ مل سکا، البتہ اُن کے ایک شاگرد اسماعیل بن عبدالصادق الخطیب کے متعلق لکھا ہے کہ "اخذ عنہ صدر الاسلام ابو الیسر محمد بن محمد بن عبدالکریم البزدوی" (فوائد صـ۲۳) جس کا مطلب یہ ہوا کہ فخر الاسلام کے بھائی نے اپنے دادا کے شاگرد اسماعیل الخطیب سے تعلیم پائی تھی، لیکن خود فخر الاسلام کے اساتذہ میں ہم اسماعیل الخطیب کا نام نہیں پاتے جو یقیناً محل تعجب ہے۔ اسماعیل الخطیب ان کے دادا کے شاگرد تھے علمی جلالت شان کے لیئے یہی کیا کم ہے کہ صدر الاسلام جیسے امام ان کے تلمیذ وحید ورشید ہیں، میرا خیال ہے کہ فخر الاسلام کی ابتدائی تعلیم کا کچھ نہ کچھ حصہ اسماعیل الخطیب کے پاس بھی ضرور گزرا ہے لیکن تعلیم کی تکمیل چونکہ شمس الائمہ الحلوائی کے حلقہ میں ہوئی اس لیے تعلیمی انتساب انہی کی طرف ہوگیا، ایک بڑا قرینہ اس کا یہ بھی ہے کہ فخر الاسلام کی کتابوں میں معقولیت اور کلامیت کا رنگ بہت نمایاں ہے اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ امام الہدیٰ ابو منصور ماتریدی سے وہ بہت متاثر ہیں، اب خواہ اس کی یہی وجہ ہو کہ ماتریدیہ سلسلہ کے اس عالم اسماعیل سے بھی اُنھوں نے پڑھا ہو جو فخر الاسلام کے دادا عبدالکریم تلمیذ ابو منصور کے شاگرد تھے یا ان کی کتابوں سے متاثر ہوئے ہوں۔ بہرحال جس کا خاندان ہی ابو منصور ماتریدی کے تعلیمی رشتہ سے منسلک ہو اس کے متعلق سچ تو یہ ہے کہ اس سوال ہی کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ اِن سے کیوں متاثر تھے۔

یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اسلام کے جس صدی میں اس وقت ہیں یہ سلجوقیوں کے اقبال و عروج کا زمانہ ہے، کچھ اشارہ اس کی طرف پہلے بھی شمس الائمہ سرخسی کے ذکر میں گزر چکا ہے۔ فخر الاسلام۔ اور صدر الاسلام اِن دونوں کا زمانہ ٹھیک وہی ہے جب اسلام کے مشرقی ممالک پ

الپ ارسلان اور اُس کے بعد اس کے بیٹے ملک شاہ سلجوقی کا قبضہ تھا، خصوصاً زیادہ وقت اُن لوگوں کا ملک شاہ کے عہد میں گزرا۔ ملک شاہ اور اُن کے وزیر باتدبیر نظام الملک طوسی کی بدولت علم اور دین کا شباب رفتہ جس آن بان سے واپس ہوا ہے اُس کو تاریخوں میں پڑھنا چاہیئے، ہر طرف امن و امان کا دورہ تھا۔ بڑے بڑے جامعات (نظامیۂ نیشاپور، نظامیۂ بغداد، نظامیۂ بصرہ، مدرسۂ اصفہان وغیرہ وغیرہ اُسی زمانہ کی یادگاریں ہیں۔

بزدہ کے اِن دونوں بھائیوں کو راحت و عافیت کا وہی عہد ملا ہے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دونوں کا تقرر حکومتِ وقت کی جانب سے عہدہ قضا پر ہوا، فخر الاسلام سمرقند کے قاضی تھے اور صدر الاسلام کا مستقر بخارا تھا، آخر زمانے میں جب بڑے بھائی یعنی فخر الاسلام کا انتقال ہو گیا تو صدر الاسلام کو سمرقند کا قاضی القضاۃ بنا دیا گیا تھا۔ الجواہر المضیئہ میں ہے۔ "کان قاضی القضاۃ بسمرقند" (ج ۲ ص۲۷۰)

بظاہر دونوں بھائیوں میں بڑے مخلصانہ تعلقات تھے، لکھا ہے کہ سمرقند میں جب فخر الاسلام کا انتقال ہوا بخارا سے اُسی وقت سمرقند پہنچے اور یتیم بھتیجے حسن بن علی کو ساتھ لے گئے اور اپنے زیر تربیت رکھکر ان کی تعلیم کی تکمیل کی، بعد کو مدت تک حسن بن علی بھی بخارا کے قاضی رہے۔

اِن دونوں بھائیوں کے فقہی کارنامے اس زیادہ طویل گفتگو کی ضرورت یہ پیش آئی کہ جہاں تک قیاسات وقرائن کا اقتضاد ہے اِن دونوں بھائیوں نے تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں اتفاقاً نہیں بلکہ سوچ سمجھکر ایک نئی راہ نکالی۔ مجھے اس وقت دوسرے علوم سے سردست بحث نہیں ہے۔ بلکہ صرف "اصول فقہ" کے متعلق یہ بتانا ہے کہ اِس فن کے متعلق اوروں کے سوا جیسا کہ بتفصیل گزر چکا خود طبقۂ احناف کے علماء نے بڑے بڑے کام کئے، الماتریدی۔ الجصاص۔ الدبوسی السرخسی جیسے ائمہ اعلام کی تصنیفیں جب اس فن میں لکھی جا چکی تھیں تو اِس سے زیادہ کیا چاہا جا سکتا تھا۔ گویا مسائل کی حد تک جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ان دو بھائیوں کا خیال یہ ہوا کہ وہ کتابوں میں مدون ہو چکے ہیں۔ اب بظاہر دو باتوں کی ضرورت تھی ایک تو یہ کہ اِن تمام بکھرے ہوئے منتشر مسائل کو صاف صاف سلجھی ہوئی زبان میں مرتب کیا جائے۔ یہ تو پہلی ضرورت تھی جو غالباً ان دونوں نے محسوس کی خصوصاً امام الہدیٰ جو حنفیوں میں گویا اس فن کے معمار اوّل ہیں ان کا طریقہ بیان کچھ ایسا تھا کہ عام لوگوں کے لیئے مطالب کا استخراج اِن کی کتابوں سے آسان نہ تھا۔ حاجی خلیفہ نے شمس النظر علاء الدین الامام الحنفی کی کتاب "میزان الاصول" کے حوالے سے (جس کا کسی موقعہ پر پہلے بھی ذکر آ چکا ہے) یہ نقل کیا ہے:۔

وقع فی غایۃ الاحکام والاتقان بعیدا و ممن جمع الاصول والفروع مثل "ماخذ الشرع" "وکتاب الجدل" للماتریدی وغیرھما

یعنی اتقان واحکام واستواری ومضبوطی میں ان کتابوں کا جو حال بھی ہو، لیکن لکھا ہے کہ "لتوحش الالفاظ والمعانی" عوام کی توجہ ان کی طرف زیادہ نہ ہوئی، حاجی خلیفہ ہی نے الماتریدی کی کتاب "تاویلات القرآن" کے تذکرہ میں یہ لکھ کر کہ یہ کتاب خود ان کے قلم کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ کتاب کے مولف ومرتب تو علاء الدین سمرقندی صاحب "تحفۃ الفقہا" ہیں، لیکن الماتریدی کی طرف اس کا انتساب اس لیے کیا جاتا ہے کہ علاء الدین نے دراصل اس کتاب کو اُن تقریروں سے مرتب کیا ہے جو الماتریدی کے شاگردوں نے سُن سُن کر متفرق طریقے سے جمع کی تھیں، غرض اس قصے کو درج کرتے ہوئے حاجی نے بھی لکھا ہے کہ :-

وھی ما اخذ منہ اصحابہ المبرزون تلقفاً	یہ وہ ہے جس کو اُن کے سر برآوردہ شاگردوں نے سن کر حاصل کیا اور اس لیے یہ انکی کتابوں میں سمجھنے کے لحاظ سے آسان ہے،
وبھذا کان اسھل تناولا من کتبہ (ص ۱۳۲)	

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ الماتریدی کی کتابوں سے استفادہ عام لوگوں کے لیے دشوار تھا۔

الغرض پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ امام الہدیٰ کی اِن کتابوں کے مسائل کو آسان اور سلیس پیرائے میں بیان کیا جائے جو اپنے الفاظ اور معنی کے توحش کی وجہ سے لوگوں کو کم فائدہ پہنچا رہی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ بیان کے اس طریقہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کتابوں میں حد سے زیادہ طوالت پیدا ہو جائے اتنی طوالت کہ طلبہ کے لیے اُن کا ختم کرنا ناممکن ہو جائے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اسی چیز نے اس کی ضرورت بھی اُن لوگوں کو محسوس کرائی، کہ جہاں سلیس اور سلجھی ہوئی عبارت میں کتابیں لکھی جائیں وہیں اختصار کا بھی خیال رہے تاکہ کم سے کم مدت میں فن کے تمام مسائل پر طلبہ کی نظر پڑ جائے، غالباً یہ طے کیا گیا کہ اصول فقہ کے تمام مسائل کو مختصر سے مختصر عبارت میں کچھ اس طرح ادا کیا جائے کہ جو کچھ بزرگوں نے اب تک لکھا ہے سب اس میں سمٹ جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے بعد کو اسلامی تالیفات میں متون کا رواج جو ہر فن میں ہوا اس کا یہی ابتدائی تصور تھا اور یہی دوسری ضرورت تھی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ تفصیلات کا تو علم نہیں لیکن پھل سے اگر درخت پہچانا جا سکتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ پہلی ضرورت کے حل کی ذمہ داری صدر الاسلام چھوٹے بھائی کے سپرد ہوئی۔ اور دوسرا کام جو غالباً پہلے کام کے حساب سے نسبتاً زیادہ سخت اور دشوار تھا یہ فخر الاسلام علی بڑے بھائی کے حوالہ ہوا۔

صدرالاسلام کی تصنیفات | صدرالاسلام نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے اُس کا اندازہ تو آپ کو اسلامی علوم کے مورخین کے اُن الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ "القند" جو سمرقند کی مشہور تاریخ ہے اور خود صدرالاسلام کے براہِ راست شاگرد عمر بن محمد النسفی کی تصنیف ہے، صدرالاسلام کا ترجمہ اُس اِن الفاظ پر ختم کیا ہے۔

ملاء المشرق والمغرب بتصانیفہ — اُصول اور فروع میں اپنی تصنیفات سے انہوں نے

فی الاصول والفروع (الجواہر ص۲۷۱) — مشرق و مغرب کو بھر دیا۔

اگرچہ صدرالاسلام کی کوئی کتاب اس وقت تک زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہلِ علم کے سامنے نہیں آئی ہے۔ لیکن مطبوعہ کتابوں خصوصاً "کشف بزدوی" میں بکثرت اِن کی عبارتوں کے نمونے ملتے ہیں، بلکہ ابھی چند سطر پہلے الماتریدی کی "تاویلات القرآن" کے قصہ میں حاجی خلیفہ کے حوالہ سے جو بیان گذرا یعنی کہ ماتریدی کے خیالات و تقریروں کو علاء الدین سمرقندی[۱] نے آٹھ جلدوں میں مرتب کیا ہے، ہم کتابوں میں اُن کے متعلق پڑھتے ہیں کہ :-

محمد بن احمد ابوبکر علاء الدین — محمد بن احمد علاء الدین سمرقندی نے صدرالاسلام

السمرقندی تفقہ علی صدر الاسلام — ابوالیسر البزدوی سے فقہ سیکھا

ابوالیسر البزدوی (ص۲۷۱)

اِس سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے کہ یہ اُن کے اُستادہی کی مشن کی گویا تکمیل تھی۔

فخر الاسلام بزدوی کی تصنیفات | رہا دوسرا کام جو بڑے بھائی فخر الاسلام بزدوی کے سپرد ہوا تھا تو وہ ظاہر ہے کہ مستغنی عن البیان ہے۔ آج علمی دنیا میں کون ہے جو بزدوی کے اس متن متین سے واقف نہیں ہے۔ جب سے فخر الاسلام نے اصول فقہ کا یہ متن مدون کیا ہے۔ پانچویں صدی سے لیکر تقریباً چار پانچسو سال تک کم از کم تمام حنفی ممالک کے مدرسوں میں یہی کتاب منتہیانہ کتاب

---

[۱] یہ وہی ابوبکر علاء الدین سمرقندی ہیں جن کی کتاب "تحفۃ الفقہاء" بہت مشہور ہوئی انہی کی صاحبزادی جن کا نام "فاطمہ" تھا اپنے وقت کی زبردست فقیہہ تھیں صاحب بدائع ابوبکر کاشانی سے ان کی شادی ہوئی تاریخوں میں ان کے مختلف دلچسپ علمی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ۱۲

سمجھی گئی۔ میرا تو خیال ہے کہ تصنیفی دنیا میں اس قسم کے" متن کا یہ پہلا نمونہ ہے اور بے مثل نمونہ ہے
حاجی خلیفہ نے اصول فخر الاسلام البزدوی کے زیر عنوان بالکل صحیح لکھا ہے۔

کتاب عظیم الشان جلیل البرهان	کتاب ہے اپنی شان میں بڑی دلائل میں بزرگ و
محتوی علی لطائف الاعتبارات باوجز	جلیل، لطیف اعتباروں سے مملو ہے۔ اور مختصر
العبارات یأتی الطلبة مرامه	عبارتوں میں مضامین ادا کئے گئے ہیں، طلبہ حالانکہ
واستعصی علی العلماء زمامه قد	مطلب سمجھ جاتے ہیں لیکن علماء کے لئے اس کتاب کی
انغلقت الفاظه وخفیت رموزه	لگام کو قابو میں رکھنا دشوار ہے۔ الفاظ سربند ہیں اور
والحاظه (کشف الظنون- ج ا ص۹)	اس کے اسرار و رموز پوشیدہ ہیں (ور آل اس کتاب کے
	کال ممتنع ہونے کی طرف اشارہ ہے)۔

ہمارے ملک کے مشہور معقولی اور اصولی عالم مولینا بحر العلوم "مسلم الثبوت" کی شرح کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:-

تلك العبارات کانها صخور مرکوز	اس کتاب کی عبارتیں گویا چٹانیں ہیں جن میں جواہر
فیها الجواهر واوراق مستور فیها	گڑے ہوئے ہیں اور پتے ہیں جن کے نیچے خوبصورت
الزواهر تحیرت اصحاب الاذهان	کلیاں پوشیدہ ہیں۔ اس کے معانی کے اخذ کرنے
الثاقبه فی اخذ معانیها وقنع	میں تیز اذہان بھی متحیر ہو جاتے ہیں اور اس کے
الغائصون فی بحارها بالاصداف	معانی کے سمندر میں غوطہ لگانے والے موتیوں کے
عن لآلیها۔ (فواتح الرحموت ص۵)	بجائے سیپ پر قناعت کرتے ہیں۔

خدا ہی جانتا ہے کہ ان سات آٹھ صدیوں میں مشرق و مغرب کے علماء نے اس کتاب کی کامل و ناقص کتنی شرحیں لکھی ہیں، اور تعلیقات و حواشی کو اس کتاب کے کون گن سکتا ہے اس سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ صاحب "درۃ التاج" علامہ قطب الدین شیرازی کے متعلق ان کے شاگرد اکمل الدین بابرتی نے بیان کیا ہے کہ:-

انه حضر عند الامام المحقق	میں (بابرتی) الامام المحقق قطب الدین شیرازی کی
قطب الدین الشیرازی عند موته	موت کے وقت حاضر ہوا۔ اُنھوں نے (شیرازی نے)

فاخرج کراریس من تحت وسادتہ	اپنے تکیہ کے نیچے سے تقریباً پچاس جز کاغذ کے
نحو خمسین قال ھو ما جمعت علیٰ	نکالے اور فرمانے لگے کہ یہ وہ مباحث ہیں جو میں نے
کتاب فخر الاسلام تتبعت علیہ	فخر الاسلام کی کتاب کے متعلق لکھے ہیں ایک بڑے زمانے
زماناً کثیراً ولم اقدر علیہ (ص۹)	اس کے پیچھے لگا رہا اور پھر بھی اس کے حل پر قادر
	نہ ہو سکا ہوں۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تجربہ کی بات ہے جس کے طرف حاجی خلیفہ نے اشارہ کیا ہے: "باقی علی الطلبۃ مرامہ" یعنی طلبہ کو فائدہ پہنچانے میں بھی یہ کتاب کمی نہیں کرتی کیونکہ درحصل اس کی عبارت سہل ممتنع ہے۔

بہرحال ان دونوں بھائیوں کا جو کام دنیا میں پیش ہوا لوگوں نے اس کو دیکھ کر کیا۔ پھر یہ ہوا کہ خود اپنے اپنے منقسمہ فرائض کی نوعیت کو پیش نظر رکھ کر خود انہی دونوں اماموں نے اپنی وہ عجیب و غریب کُنیتیں رکھی ہیں جن کا ذکر تاریخوں میں بایں الفاظ کیا جاتا ہے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے طبقات کے "الکنی" میں لکھتے ہیں:۔

ابو العسر البزدوی فخر الاسلام علی	فخر الاسلام علی بن محمد البزدوی کی کنیت "ابو العسر"
بن محمد کنی بہ لان تصانیفہ	ہے کیونکہ ان کی تصانیف نہایت دقیق اور اکثر لوگوں کے
دقیقۃ بتعسر الفھم علی اکثر	لیے "مشکل الفہم" ہیں۔ اور اُن کے بھائی کی "ابو الیسر" کنیت ہے،
الناس وکنی اخوہ ابو الیسر لیسر تصانیفہ	کیونکہ اُن کی تصانیف آسان ہیں:۔
(فوائد بہیہ ص۹۸)	

بظاہر اس عبارت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کُنیتیں دونوں نے خود اپنی آپ ہی رکھی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں بھائیوں نے دو مختلف حیثیتوں سے اس فن کی کامیاب خدمت کی۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ بڑے صاحب فخر الاسلام کی وفات پہلے ہوئی۔ یہ ۴۸۲ھ کا سال تھا ٹھیک اس کے تین سال بعد ۴۸۵ھ میں ملک شاہ سلجوقی کا بھی انتقال ہو گیا، صدر الاسلام کی وفات پانچویں صدی کے اختتام یعنی ۴۹۳ھ میں بمقام بخارا ہوئی۔

اس وقت تک میں نے جن کتابوں اور اُن کے مصنفین کا ذکر کیا ہے یہ حنفی طبقہ ہی کے علماء تھے

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے طبقات میں کام نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ امام شافعی کے بعد شوافع اہلِ حدیث معتزلہ سب ہی اس فن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ لیکن ابتدائی صدیوں میں جو کتابیں ان لوگوں نے تصنیف کیں نہ اُن کتابوں کا پتہ ہے نہ اُن کے مصنفین کا۔ یوں اگر زیادہ دیدہ ریزی کی جائے تو تھوڑی بہت نشان دہی اِن کی بھی ممکن ہے جیسے الجبائی کی کتاب العہد کا پتہ ابن خلدون نے دیا ہے۔ لیکن مقالہ کافی طویل ہو چکا ہے۔ بالفعل صرف حنفی مکتبِ خیال کے علماء کی جن خدمات کا تذکرہ میں کر چکا ہوں اُسی پر بس کرتا ہوں اگر اب اتنی ہی تفصیل سے دوسروں کے متعلق کام لیا جائے گا تو مقالہ مقالہ نہیں بلکہ کتاب بن جائیگا تاہم آخر میں چاہتا ہوں کہ اجمالی ہی فہرست دوسرے طبقات کے ان مصنفین اور کتابوں کی بھی دیدوں جو عام طور پر مشہور ہیں۔ اجمال سے کام لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب جن لوگوں کا تذکرہ کیا جائے گا عموماً لوگ ان کو جانتے ہیں، بخلاف ہمارے اُن حنفی علماء کے جن کے ذکر میں میں نے ذرا طوالت سے کام لیا۔ ان سے اور اُن کی خدمات سے غیر تو غیر خود حنفی عوام ہی نہیں بلکہ علماء بھی کم ہی واقفیت رکھتے ہیں۔

"الاستاذ" اور "امام الحرمین" جہاں تک سرسری معلومات کا تعلق ہے شوافع میں فن اصول فقہ کے لحاظ سے جو ہستیاں نمایاں ہوئیں اُن میں پانچویں صدی کے دو مشہور عالم شیخ ابو اسحاق شیرازی (المتوفی ۴۷۶ھ) المعروف "بالاستاذ" او ر امام الحرمین (المتوفی ۴۷۸ھ) ہیں۔ گویا حنفی طبقہ میں جو زمانہ فخر الاسلام "ابو العسر" اور صدر الاسلام "ابو الیسر" کا ہے وہی عہد ان بزرگوں کا بھی ہے جیسا کہ پہلے ہی ذکر آ چکا ہے یہ سلجوقیوں کا عہد ہے، ملک شاہ سلجوقی کے زمانہ میں حکومت کا سارا اختیار نظام الملک طوسی کے ہاتھ میں تھا جو خود اہل علم ہونے کے ساتھ ساتھ مسلکاً شافعی تھے۔ نظام الملک نے انہی دونوں شافعی عالموں کے لیے نظامیہ مدارس بنوائے۔ نیشاپور کا مدرسہ تو امام الحرمین کے لیے بنایا گیا اور بغداد کا "الاستاذ" ابو اسحاق شیرازی کے لیے۔ ثانی الذکر یعنی "الاستاذ" نے اصول فقہ میں "اللمع" نامی متن لکھا جو چھپ بھی گیا ہے اور خود ہی اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ ابن خلکان نے "اللمع وشرحہ" کے علاوہ "النکت فی الخلافیات اور" الجدل" میں "التبصرة" نیز "المعونة التلخیص" تین کتابوں کا نام لیا ہے۔ اسی طرح امام الحرمین کی "البرہان" اصول فقہ کی مشہور کتاب ہے۔ ایسے ہی

فرقۂ معتزلہ میں پانچویں صدی کے مشہور معتزلی متکلم ابو الحسن کی کتاب "المعتمد" نامی بھی اس زمانہ کی مشہور و معروف کتاب ہے۔ ابن خلکان نے ابو الحسن کے حال میں لکھا ہے۔

له التصانيف الفائقة فی اصول الفقه منها المعتمد وهو کتاب کبیر (ص۲۸)	اصول فقہ میں اس کی کئی اعلیٰ تصانیف ہیں جن میں سے ایک "المعتمد" بھی ہے۔ جو ایک ضخیم کتاب ہے۔

قاضی ابن خلکان ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ "وانتفع الناس بکتبه" (لوگوں نے اس کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا) ابو الحسن کا نام محمد بن علی الطیب البصری تھا ۳۶۳ھ میں بمقام بغداد وفات ہوئی۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ الدبوسی (المتوفی ۴۳۰ھ) کا ہم عصر تھا۔

امام غزالی | ابھی پانچویں صدی ختم بھی نہیں ہوئی ہے، امام الحرمین زندہ ہی تھے کہ ان کے حلقۂ تلامذہ میں اسلام کی وہ حجت شریک ہوئی جسے دنیا "الغزالی الامام" کے نام سے پہچانتی ہے۔ امام کی ولادت ۴۵۰ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن طوس میں حاصل کی بالآخر نیشاپور پہونچ کر امام الحرمین کے درس میں شریک ہوئے ابن خلکان نے لکھا ہے:۔

وجد فی الاشتغال حتی تخرج فی مدة قریبة وصار من الاعیان المشار الیهم فی زمن استاذه وصنف فی ذالك الوقت (ص۶۲۳)	انھوں نے مشغولیت میں بڑی محنت کی، اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں فارغ ہو گئے اور ان ممتاز ہستیوں میں ہو گئے جن کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاتا تھا۔ یہ حیثیت ان کو اپنے استاد ہی کی زندگی میں حاصل ہو گئی اور اسی زمانہ میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔

فن اصول فقہ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ امام غزالی نے بھی اس فن کی خدمت میں اپنا کافی حصہ ادا کیا اور کوئی ایک نہیں بلکہ جس طرح مختلف علوم فنون میں امام نے مختصر و متوسط اور مطول کتابیں لکھی ہیں اصول فقہ میں بھی ان کی چند کتابیں ہیں، ابن خلکان نے لکھا ہے:۔

وله فی اصول الفقه المستصفی فرغ من تصنیفه سادس المحرم سنة ۵۰۳ھ ثلاث وخمس مائة وله المنخول	اصول فقہ میں ان کی تصنیف "المستصفیٰ" ہے جس کی تصنیف سے وہ ۶ محرم ۵۰۳ھ میں فارغ ہوئے۔ "المنخول" اور "المنتحل" بھی انہی کی کتابیں ہیں

خود امام نے "المستصفیٰ" کے دیباچہ میں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ "علم طریق الآخرۃ ومعرفۃ اسرار الدین الباطنۃ" کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے :-

صنفت کتباً کثیرۃ فی فروع الفقہ واصولہ	فقہ کے فروع اور اصول میں میں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔

امام نے لکھا ہے کہ دوسری دفعہ مراتب سلوک کے طے کرنے کے بعد جب درس کے مشغلہ میں مجھے مبتلا ہونا پڑا تو طلبہ، فقہ، اصول فقہ کی ایک ایسی کتاب لکھنے پر مُصر ہوئے کہ وہ۔

دون کتاب تہذیب الاصول لمیلہ الی الاستقصاء والاستکثار وفوق کتاب المنخول لمیلہ الی الایجاز والاختصار (مستصفی)	"تہذیب الاصول" سے تو کم ہو کیونکہ اس کا رجحان مسائل کی کثرت اور استقصاء کی طرف ہے اور کتاب "المنخول" سے بڑھ کر ہو کیونکہ اس کتاب میں رجحان زیادہ اختصار اور ایجاز کی طرف ہے۔

جس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ اصول فقہ میں کوئی طویل کتاب ان کی "تہذیب الاصول" نامی بھی ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ "المنخول" امام ہی کی کتاب ہے مگر تعجب ہے کہ "تہذیب الاصول" کا ذکر کسی کتاب میں اب تک نظر سے نہیں گزرا۔ مذکورۂ بالا عبارت سے اس شبہہ کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے جو بعضوں کو ہوا ہے کہ "منخول" امام کی کتاب نہیں ہے۔ حاجی خلیفہ کا بھی غالباً یہی خیال ہے۔ کشف الظنون میں انھوں نے "منتحل" کا تو نام لیا ہے لیکن منخول کا ذکر ہی نہیں کیا۔ مگر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ امام نے ان دونوں (تہذیب الاصول اور منخول) کو جب اپنی تصنیف نہیں بتایا ہے تو محض اس لیے کہ ان کتابوں کا ذکر اس موقعہ پر کر دیا ہے اس کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ یہ دونوں کتابیں ان ہی کی ہیں۔ بلکہ تہذیب الاصول کا انتساب کسی نے بھی ان کی طرف نہیں کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ المنخول کا بھی یہی حال ہو واللہ اعلم۔

بہر حال "المستصفیٰ" اصول فقہ میں امام کی آخری کتاب ہے اور ابن خلکان نے "مستصفیٰ" کے اختتام کی جو تاریخ لکھی ہے اس کے تو یہ معنی ہیں کہ سن وفات ۵۰۵ھ سے کل دو سال پہلے لکھی گئی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس پاکیزگی اور صفائی کے ساتھ امام نے اصول فقہ کے مسائل کی تعبیر "المستصفیٰ" میں کی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا

فن اور اس کے مسائل پر انتہائی طور پر قابو یافتہ ہے۔ اور وہ قابو یافتہ ہوتے لوگوں جو خصوصاً بروشن ضمیری اور دل آگاہی کی دولت کے بعد۔ بلکہ اس کتاب میں ان کا تلو دوسرے ائمہ مثلاً امام ابوحنیفہ وغیرہ کے متعلق احترامات سر مو متجاوز نہیں ہوا ہے اور یہ اسی انقلاب کا نتیجہ ہے جس سے گزر کر اب وہ تمکین کی حالت میں تھے ورنہ "منخول" میں یعنی غزالی نے دوسرے ائمہ کی شان میں انھوں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں لوگوں کو ان پر حیرت ہوتی ہے۔ بلکہ امام کی طرف انتساب سے جن لوگوں کو انکار ہے اس کی ایک وجہ اس کتاب کا طرز بیان بھی ہے۔

الامام الکردری | اس موقع پر غالباً اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ چھٹی صدی کے ایک حنفی عالم محمد بن عبدالستار الکردری (المولود ۵۵۹ھ والمتوفی ۶۴۲ھ) جو شمس الائمہ کے لقب سے بھی ملقب ہیں، احناف میں ان کا مقام بڑا عالی مانا جاتا ہے خصوصاً اصول فقہ کے فن کے تو مجدد سمجھے جاتے ہیں۔ الکفوی کے حوالہ سے مولانا عبدالحی مرحوم نے یہ فقرہ نقل کیا ہے:-

اقر بالفضل والتقدم اهل زمانه	ان کے علم اور علمی برتری کا اعتراف ان کے معاصرین
حتی قیل انه احیی له الفروع والاصول	نے کیا ہے۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ ابو زید دبوسی کے بعد
بعد ابی زید الدبوسی (ص۱۷۶)	انھوں نے ہی فروع اور اصول کے علوم کو زندہ کیا۔

لیکن افسوس ہے کہ اصول فقہ میں ان کی کسی کتاب نے شہرت نہیں حاصل کی۔ صرف ایک کتاب کا ذکر مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے یعنی وہی الغزالی کی "منخول" کا الکردری نے جو رد لکھا ہے مولانا عبدالحی کے الفاظ یہ ہیں:-

فرأيت له رسالة في الرد على المنخول	میں نے منخول پر کردری کا رد دیکھا ہے، منخول
للامام الغزالي مشتملة على التشنيع	وہی جو غزالی کی طرف منسوب ہے، اور اس میں
والتقبيح على الامام ابي حنيفة	امام ابوحنیفہ پر بہت کچھ طعن کیا گیا ہے کردری
اولها الحمد لله رب العالمين	کی کتاب کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے:-
..... الخ رتبه على ستة فصول	الحمد للہ رب العالمین ..... انھوں نے چند
تعقب فيها على الغزالي قولا قولا	فصلوں پر اس کو تقسیم کیا ہے اور غزالی کے ایک ایک
وذكر فيها مناقب ابي حنيفة۔	قول کو لے کر اس پر خوب لے دے کی ہے اور امام

ابوحنیفہ کے مناقب اس ذیل میں بیان کرتے چلے گئے ہیں۔

مولینا نے اس کے بعد اپنی رائے اس رسالہ کے متعلق یہ قائم فرمائی ہے۔

وھی رسالة نفیسة جداً مشتملہ	بڑا اچھا رسالہ ہے اور عمدہ بحثوں پر مشتمل ہے ؛
علی ابحاث شریفة الا انہ لبسط	لیکن اس میں ایک تو طول باقی ہے اور بعض مقامات پر
الکلام وفی بعض مواضعھا	حضرت امام شافعی اور ان کے پیروؤں پر جواباً
بالشناعة علی الامام الشافعی واتباعہ	طعن وتشنیع سے کام لیا گیا ہے۔

مگر اس کے بعد خود ہی اس کا جواب بھی دیتے ہیں :۔

ولکنہ بالنسبة الی تشنیع الغزالی	لیکن غزالی کی منخول میں لعن وطعن کا جو حصہ ہے
علی ابی حنیفة قلیل جداً فوائدا	اس سے کہیں کم ہے۔

خیر کچھ بھی ہو امام غزالی نے جب "المستصفیٰ" میں اپنا رویہ بدل دیا تو اب ان سے شکایت ہی فضول ہے۔

امام الحرمین کی کتاب " البرہان " اور الغزالی کی " المستصفیٰ " کے بعد اہل السنت والجماعت کی طرف سے گویا یہ فن کمال کو پہنچ چکا تھا، لیکن ابھی ایک کام باقی تھا، مطلب یہ ہے کہ جیسا میں بیان کرتا چلا آیا ہوں کہ اہل سنت میں احناف وشوافع جہاں تک میں اس فن میں لکھ رہے تھے انہی کے بالمقابل معتزلہ کا قلم بھی کام کر رہا تھا، جس طرح امام الحرمین اور غزالی نے سنیوں میں اس سلسلہ کو مکمل کیا تھا معتزلہ میں ابوالحسن البصری نے "معتمد" لکھکر اعتزالی اصول فقہ کو گویا آخری معراج کمال تک پہنچا دیا تھا اگرچہ یہ دونوں بالمقابل فرقوں کے علماء ایک دوسرے کی نظریات کا ذکر اپنی کتابوں میں کرتے تھے لیکن عموماً یہ تذکرہ تردید کے لئے کیا جاتا تھا مگر دونوں شعبوں کی کتابوں کے نظریات کو "خذ ما صفا دع ما کدر" کے اصول پر ایک جگہ جمع کرنے کا کام غالباً اب تک کسی نے نہیں کیا تھا۔

یہ بات بھی شافعیوں کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی کہ جس طرح ان کا امام اس فن کا بانی تھا اسی طرح اس فن کے آخری کام کو اس طبقے ہی کے دو عالموں نے مختلف حیثیتوں سے انجام دیا

الامام الرازی والعلامہ الآمدی | حضرت امام غزالی کا انتقال ۵۰۵ھ میں ہوا۔ اس لحاظ سے

اگر دیکھیے تو امام غزالی ہی کی زندگی ہی میں یعنی ۵۴۳ھ یا ۵۴۴ھ میں امام فخر الدین رازی پیدا ہوئے۔ امام رازی کے والد عمر بن الحسین بہ یک واسطہ امام الحرمین کے شاگرد تھے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ:-

ذکر فخر الدین فی کتابہ الذی سماہ تحصیل الحق انہ اشتغل فی علم الاصول علی والدہ عمرؔ و والدہ علی ابی القاسم سلیمان بن ناصر الانصاری وہو علی امام الحرمین (ابن خلکان ج ۱ ص۴۷۴)	امام رازی نے اپنی کتاب تحصیل الحق میں لکھا ہے کہ انھوں نے تعلیم اپنے والد عمر سے پائی، اور ان کے والد نے ابو القاسم سلیمان بن ناصر انصاری سے، اور الانصاری نے امام الحرمین سے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اہل سنت والجماعت کے علماء حنفی ہوں یا شافعی جن جن بزرگوں نے بھی اصول فقہ کے متعلق اب تک لکھا تھا ان میں جیسا کہ گزر چکا بہت سے حضرات علم کلام کے اگرچہ امام تھے لیکن یونانی فلسفہ و منطق کی باضابطہ تعلیم کسی نے حاصل نہیں کی تھی حتیٰ کہ الغزالی نے بھی خود ہی فلسفہ و منطق کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا کسی اُستاد سے باضابطہ ان فنون کے سیکھنے کا ان کو بھی موقعہ نہیں ملا تھا، جس کا اظہار اُنھوں نے خود "الجام العوام" وغیرہ میں کیا ہے" الغرض امام رازی ہی اس سلسلے کے پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ کے مشہور فیلسوف و منطقی مجد جیلی سے ان فنون کی کتابیں باقاعدہ پڑھیں۔ حتیٰ کہ جب رَے سے مجد جیلی مَراغہ بلائے گئے تو امام پر ان فنون کا شوق اس درجہ مستولی تھا کہ وہ بھی مجد جیلی کے ساتھ مَراغہ چلے گئے اور بقول ابن خلکان

وقرأ علیہ مدۃ طویلۃ علم الکلام والحکمۃ (ص۴۷۵)	مجد جیلی سے مدتوں علم کلام اور حکمت (فلسفہ) پڑھتے رہے

ظاہر ہے کہ اس کا اثر امام پر پڑنا چاہیے تھا۔ ان کے ایک شاگرد تاج الارموی نے یہ بتاتے ہوئے کہ امام رازی کو اصول فقہ میں ایک الگ کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی یہ وجہ لکھی ہے کہ "صنف فی اصول الفقہ کتب متعددۃ مستکثرۃ غیر ان الدعاوی والدلائل فیہا متبددۃ منتشرۃ خلا کتاب المحصول صنفہ شیخنا الامام الرازی" (کشف الظنون ص۴۳)

مطلب یہ ہے کہ بیان و استدلال میں منطقیت گویا ان کتابوں میں کم پائی جاتی تھی، اس نقص کا ازالہ امام کے قلم نے کیا۔

ادھر خراسان میں تو امام رازی پیدا ہوئے اور دوسری طرف آمد (کردستان) میں ٹھیک اسی سال جس سال امام غزالی کی وفات ہوئی یعنی ۵۰۵ھ میں دوسری ہستی ظاہر ہوئی جو علامہ سیف الدین الآمدی الاصولی الفقیہ کے نام سے مشہور رہے۔ ان کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ "احکم الاصلین والفلسفہ وسائر العقلیات واکثر من ذالک" (یعنی دونوں اصول (اصول عقائد اور اصول فقہ) کو مضبوط کیا۔ اور فلسفہ کو بھی۔ بلکہ تمام عقلی علوم میں کمال پیدا کیا اور بہت زیادہ مشغلہ ان کا رکھا)۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ فلسفہ کے ذوق میں اونھوں نے یونانی اور سریانی زبانیں بھی سیکھی تھیں۔ اسی وجہ سے لوگ ان کے عقائد سے کچھ بھڑکے ہوئے بھی تھے۔ بہر حال یہ اتفاق کی بات ہے کہ پانچویں صدی کے اختتام اور چھٹی صدی کے آغاز میں ان دونوں عالموں نے اپنے خاص عقلی رنگ میں چاہا کہ اہل سنت اور ارباب اعتزال کی کتابوں کے مسائل کو ایک ہی کتاب میں جمع کر دیں۔ ابن خلدون نے امام الحرمین کی "البرہان" غزالی کی "المستصفی" الجبائی کی کتاب العہد" اور ابو الحسن بصری کی "المعتمد" کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:-

ثم لخص هذه الكتب فحلان من المتكلمين المتاخرين وهما فخر الدين الرازي بن الخطيب في كتاب "المحصول" وسيف الدين الامدي في كتاب "الاحكام"۔	متاخرین متکلمین کے دو بڑے عالموں نے یعنی فخر الدین رازی بن خطیب نے اور سیف الدین الآمدی نے اصول فقہ کی ان تمام کتابوں (شافعی حنفی معتزلی) کتب کا ایک ہی کتاب میں خلاصہ کیا۔ "المحصول" رازی کی اس کتاب کا نام ہے۔ اور "الاحکام" الامدی کی کتاب کا

(مقدمہ ص۴۵۳)

دونوں کتابوں میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب ان الفاظ میں ابن خلدون ہی نے دیا ہے۔

واختلفت طريقهما في الفن بين التحقيق والحجج فابن الخطيب اميل الى الاستكثار	دونوں کے طریقہ کار میں یہ فرق ہے کہ دلائل کی بھرمار فخر رازی کے یہاں ہے، اور الآمدی کو زیادہ شوق مذاہب و مسائل کی تحقیق و تفریع کا ہے۔

من الادلة والآمدى مولع بتحقيق
المذاهب وتفريع المسائل (مقدمه ص۴۵۴)

سچ پوچھیے تو انہی دونوں کتابوں پر اس فن کے متعلق اجتہادی جدوجہد کی انتہا ہو گئی بلکہ معتزلہ کا تو دور ہی ختم ہو چکا تھا۔ ان میں لکھنے والے تو کیا پیدا ہوتے متقدمین کی لکھی ہوئی کتابوں کا کوئی بچانے والا بھی باقی نہ رہا بہرحال اب لوگوں نے انہی دو کتابوں امام رازی کی "محصول" اور الآمدی کی "احکام" کو اپنے غور و خوض کا محور بنالیا۔

"المحصول" کی، امام کے شاگرد تاج الدین الارموی (المتوفی ۶۱۴ھ) نے تلخیص کی اور اس کا نام "الحاصل" رکھا، دوسرے شاگرد سراج الدین الارموی (المتوفی ۶۸۲ھ) نے بھی خلاصہ کیا اور اس کا نام "تحصیل" رکھا، یہ عجیب بات ہے کہ اصول فقہ میں اب تک جو کام ہوتا رہا شافعیہ، حنفیہ یا معتزلہ ہی کرتے رہے لیکن حنابلہ اور مالکیوں کی کسی کتاب کا ذکر عام طور سے نہیں کیا جاتا۔ سب سے پہلے ایک مالکی امام احمد بن ادریس القرافی کا نام آتا ہے جنہوں نے امام رازی کی "محصول" کا خلاصہ "تنقیحات" کے نام سے لکھا۔ اگرچہ ابن خلدون نے القرافی کی کتاب کو "تحصیل" اور "حاصل" ہی کا انتطاف بتایا ہے لیکن خود القرافی کے الفاظ جو دیباچہ میں تھے اُن کو پیش نظر رکھتے ہوئے حاجی خلیفہ نے لکھا ہے:۔

جمع من المحصول واضاف اليه	امام رازی کی محصول سے مسائل جمع کئے اور
مسائل كتاب الافادة للقاضى	قاضی عبد الوہاب مالکی کی "کتاب الافادۃ" کے
عبد الوهاب المالكى ص۲۶۱۔	مسائل کا اس پر اضافہ کیا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبد الوہاب مالکی نے بھی اصول فقہ میں کوئی کتاب "افادہ" نامی لکھی تھی، لیکن اب اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حاجی خلیفہ نے بھی اپنی فہرست میں اس کو نہیں لیا ہے، القرافی المالکی کی وفات ۶۸۴ھ میں ہوئی۔ انہی کے ایک ہمعصر مشہور صاحب تفسیر قاضی بیضاوی (المتوفی ۶۸۵ھ) نے بھی بیس ورق میں "محصول" کا ایک خلاصہ تیار کیا۔ حاجی خلیفہ کے الفاظ میں "هو عشرون ورقاً بالقطع الحسنی" (ج ۲ ص۳۲۶)
خیال کرنے کی بات ہے کہ امام رازی کی "محصول" جس کے متعلق خود اُن کے شاگرد تاج

ارموی نے لکھا ہے :- "ان الطباع تتحاشاہ لکبر الحجم"[1] اس کبیر الحجم کتاب کا جب کل بیس ورقوں میں خلاصہ کیا گیا ہو تو ایک معمہ سے زیادہ وہ کتاب اور کیا ہو سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بجائے فن کے البیضاوی کے اس متن ہی کے حل میں کچھ ایسے ڈوبے کہ اس چھ سو سال کے عرصہ میں حواشی و شرح، تعلیقات و تخریجات "منہاج" بیضاوی کے جو لکھے گئے ہیں اگر ان کو یہاں درج کروں تو کئی صفحات صرف فہرست کی نذر ہوں گے۔ البلقینی، ابن الملقن، زکریا انصاری، ابن جماعہ، العراقی جیسی ہستیاں آپ کو اس کتاب کے مختلف پہلوؤں پر کام کرتی نظر آئیں گی۔ الاسنوی نے قاضی بیضاوی کے متن "منہاج" کا جو شجرہ نسب دیا ہے دلچسپی کے لئے اس کا نقل کر دینا یہاں مناسب ہوگا لکھا ہے کہ:-

اعلم ان المصنف (البیضاوی) اخذ کتابه من الحاصل للارموی والحاصل اخذه مصنفه من المحصول للفخر - والمحصول استمداده من کتابین لایکاد یخرج عنهما غالبا احدهما "المستصفی" للغزالی، والثانی "المعتمد" لابی الحسن البصری۔	معلوم ہونا چاہئے کہ بیضاوی نے اپنی کتاب کو الحاصل سے جو ارموی کی تصنیف ہے اخذ کیا ہے۔ اور الحاصل کو اس کے مصنف نے امام رازی کی محصول سے تیار کیا ہے جو فخر الدین رازی کی تصنیف ہے، اور خود محصول رازی میں دو کتابوں سے مدد لی گئی ہے گویا ان دو کتابوں کے مضامین سے بہت کم تجاوز کرتے ہیں۔ یعنی ایک تو غزالی کی مستصفی اور دوسری ابو الحسن البصری المعتزلی کی "المعتمد"

الاسنوی نے امام رازی کی کتاب محصول کے متعلق اس موقع پر یہ بھی اضافہ کیا ہے:-

حتی رأیته ینقل منهما الصفحة او قریبا منها بلفظهما	میں نے خود ملا کر دیکھا ہے کہ کہیں کہیں ایک ایک صفحہ یا اس کے قریب وہ بجنسہ ان دونوں کتابوں سے نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس کی وجہ کہ امام رازی کا قلم بے ساختہ انہی دونوں کتابوں کی عبارتیں بجنسہ نقل کرتا کیوں

---

[1] یعنی ضخامت کی وجہ سے آدمی کی طبیعت اس سے گھبراتی ہے۔

چلا جاتا ہے یہ لکھی ہے کہ "قیل انہ کان یحفظھما" (کشف ص ۲۵۶) یعنی کہا جاتا ہے کہ امام رازی کو یہ دونوں کتابیں زبانی یاد تھیں۔

امام رازی کی کتاب "محصول جس ذخیرہ سے پیدا ہوئی اور پھر اس کتاب سے جو کچھ پیدا ہوا، اس کا خلاصہ تو یہ تھا، باقی الآمدی کی کتاب "الاحکام" سو اُس کا حشر یہ ہوا کہ نحوی متن "کافیہ" کے مشہور مصنف علامہ ابن حاجب المالکی (المتوفی ۶۴۶ھ) نے اس کا ایک خلاصہ "منتہی السوال والامل فی علمی الاصول والجدل" کے نام سے تیار کیا پھر اس خلاصہ کا بھی خلاصہ کیا جو عام طور پر "مختصر ابنِ حاجب" کے نام سے مشہور ہے۔ پھر ساتویں صدی کے اختتام اور آٹھویں صدی کے آغاز میں شیراز کے مشہور عالم عضد الدین الایجی (المتوفی ۷۵۶ھ) نے اس مختصر کی شرح لکھی جو "عضدیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اور ان سے پہلے قطب الدین شیرازی صاحب درۃ التاج - (المتوفی ۷۱۰ھ) نے بھی شرح کی تھی۔ اور بھی چند علماء نے اس پر کام کیا ہے جن میں سے چھ آدمیوں کی شرح نے بڑی شہرت حاصل کی، ان کے نام حسب ذیل ہیں

(۱) رکن الدین موصلی (۲) جمال الدین حلبی (۳) زین الدین خجی (۴) شمس الدین اصفہانی (۵) بدر الدین تستری (۶) شمس الدین الخطیبی۔ قطب الدین شیرازی کی شرح کو ملا کر مختصر ابنِ حاجب کی یہ ساتوں شرحیں سبع سیارہ کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن 'عضدیہ' کا مقام کسی کو حاصل نہ ہوا۔ ٹھیک "محصول" کے خلاصہ "منہاج" کی جو کیفیت ہوئی بلکہ اس سے بھی زیادہ دلچسپی متاخرین نے "عضدیہ" سے لی۔ تفتازانی، شریف جرجانی، مرزا جان شیرازی، اکمل الدین بابرتی سب ہی کا نام اس کتاب کے خادموں میں لیا جاتا ہے۔ پھر مختصر ابن حاجب کے محشیوں شارحوں مخرجوں ناظموں میں تو تاج الدین السبکی، ابن دقیق العید، ابن مقلن بلقینی وغیرہ سب داخل ہیں۔

متاخرین کی کتابیں شروح و حواشی کے اس ہنگامہ میں آٹھویں صدی کے ایک شافعی عالم تاج الدین السبکی (المتوفی ۷۷۱ھ) نے البتہ ایک بڑی حاوی اور جامع کتاب اصول فقہ میں لکھی نام بھی اس کا "جمع الجوامع" رکھا۔ اگرچہ حواشی اور شروح کا اس پر بھی تانتا بندھ گیا لیکن اس کی اچھی شرح جلال الدین محلی (المتوفی ۸۶۴ھ) کی ہے۔ بہرحال زیادہ تر یہ کام شافعی علماء

کے تھے، البزدوی کے بعد حنفی علماء کی طرف سے کوئی خاص چیز بجز تلخیص و شرح وغیرہ کے پیش ہوئی البتہ آٹھویں صدی میں صدر الشریعۃ علامہ عبید اللہ بن مسعود المجوبی نے "تنقیح الاصول" ایک متن لکھا اور پھر خود ہی "توضیح" کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ صدر الشریعۃ المحبوبی کی وفات ۷۴۷ھ میں ہوئی۔ ان سے کچھ ہی دن بعد علامہ تفتازانی پیدا ہوئے اور "توضیح" کی مشہور شرح "تلویح" لکھی پھر "تلویح" پر حواشی و شروح کے جو انبار لگے ہیں ان کو کون گن سکتا ہے؟ بیسیوں حواشی تو صرف ہندوستان میں لکھے گئے، سلاطین ترکیہ کے عہد میں "تلویح" نے بڑی شہرت حاصل کی اور آستانبول اور اناطولیہ کے علماء نے بھی اس کتاب کی طرف خاص توجہ کی۔

آخر میں متن متین اس فن میں مشہور حنفی عالم علامہ ابن ہمام (المتوفی ۸۶۱ھ) کے قلم سحر رقم نے تیار کیا جو علماء کے حلقوں میں "تحریر لابن ہمام" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معقولیت اور منقولیت دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ آخری حنفی متن شاید اپنے گذشتہ متنوں سے کچھ زیادہ بہتر تیار ہوا ہے اس کی شرح بھی خود ابن ہمام کے تلمیذ رشید قاضی ابن امیر الحاج الحلبی الحنفی نے "التقریر" کے نام سے لکھی ہے۔ متن اپنی شرح کے ساتھ مدت ہوئی شائع ہو چکا ہے۔

یوں تو اس کے بعد بھی لوگوں نے بعض متون لکھے ہیں لیکن غالباً سب سے آخری قابل ذکر متن "مسلم الثبوت" ہے۔ اس کے مصنف ہندوستان کے عالم، عہد عالمگیر کے حیدر آباد (دکن) کے قاضی

لہ اس سے میرا اشارہ اصول فقہ کے ان چند متنوں کی طرف ہے جو بعض متاخرین نے تصنیف کیے جن میں حافظ الدین النسفی کی "منار الانوار" کی عام مدارس میں بہت شہرت ہے بکثرت شروح و حواشی اس متن پر بھی لکھے گئے لیکن آخری شرح ہندوستان میں ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی جو عالمگیری عہد کے مشہور عالم بلکہ بقول بعض بادشاہ کے استاد تھے "نور الانوار" اس کا نام ہے اور مصر میں بھی چھپ چکی ہے عجیب بات ہے کہ نویں صدی ہی میں ایک اور ہندوستانی عالم سعد الدین ابو الفضائل الدہلوی نے بھی "افاضۃ الانوار" نامی شرح "المنار" کی لکھی جس کا ذکر طاش کبری زادہ اور حاجی خلیفہ دونوں نے کیا ہے۔ "المنار" کا ایک خلاصہ بھی ابن نجیم مصری نے "لب الاصول" کے نام سے لکھا ہے کہتے ہیں کہ یہ متن تمام متنوں میں بہتر ہے۔ اس قسم کے متنوں میں "منتخب فی اصول اللب" کا متن بھی ہے، اخیکت کے مشہور عالم حسام الدین الاخسیکتی کی تصنیف ہے اور حسام الدین نامی سے جو صغناق کے رہنے والے تھے اس کی شرح لکھی جو "الحسامی" کے نام سے مدرسوں میں مشہور ہے الاخسیکتی کی وفات ۶۴۴ھ میں ہوئی اور حسام الدین صغناقی کی ۷۱۱ھ میں ہوئی بہر حال ان متنوں کی تو نہ حد ہے نہ انتہا ہر طبقہ میں ہر صدی ہر ہر ملک کے عالم نے کوئی نہ کوئی متن ضرور لکھا ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

محب اللہ بن عبد الشکور البہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ) ہیں۔ اس متن کو نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کے علمی حلقوں میں بھی قدر و عزت کی نظروں سے دیکھا گیا ہے بلکہ علماء ہند کی ان چند گنی چنی کتابوں میں ایک کتاب یہہ بھی ہے جسے مصر کے ناشرین کتب نے بھی چھاپا۔ مصر کے مطبوعہ نسخہ میں اُس کے ناشر نے لکھا ہے "اشتریتھا بنحو مائتین جنھیۃ ممن کانت تحت یدہ فی اقاصی البلدان" جس کے معنی یہہ ہوئے کہ تقریباً ۳۰۰۰ روپیہ سے زائد قیمت میں اس متن کے چند اوراق اُنھوں نے خریدے۔ علماء مصر پر اس متن کا کتنا اثر ہے اس کا اندازہ خاتمہ نگار کے اُن الفاظ سے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ اُصولِ فقہ کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے بعد یہہ لکھتے ہوئے کہ "کان علی کثرۃ متونہ مابین مختصر ومطول ومجمل ومفصل"۔ ارقام فرماتے ہیں۔ "لم یکن منھا مما ھو فی الایدی اجمع دارٔی من متن "مسلم الثبوت" للعلامہ محب اللہ بن عبد الشکور البہاری الھندی" و آخر میں اپنی رائے ان الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:- فانہ حوی من نفائس التحقیقات الانیقہ والتدقیقات الحقیقۃ بالقبول ومن مذاھب الاصولیین بادلتھا العقلیۃ والنقلیہ لم یحوہ غیرہ من الاصول فکانت لذلک مثابتہ فی الاحاطہ مثابۃ البحر المحیط من سائر الخلجان ومنزلتہ فی النفاسۃ بمنزلۃ انسان العین من عین الانسان۔

ظاہر ہے کہ ایک ہندی عالم کی ہندی کتاب کے متعلق قبۃ الاسلام مصر کے علمی دائروں کا یہ اعتراف معمولی اعتراف نہیں ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ اگر البہاری میں "اصولی مسائل" کے ساتھ کلام و فلسفہ کے غیر ضروری مسائل کے ذکر کرنے کا عیب نہ ہوتا تو ان کا یہہ متن اصول فقہ کا ایک بہترین متن ہوتا۔ شاید اس عیب سے ہندوستان کا وہ بالکل آخری متن پاک ہے جو بارہویں صدی کے مشہور مجاہد عالم مولانا اسمٰعیل شہید نے تیار کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مختلف وجوہ سے عام علماء نے اس کی طرف توجہ نہ کی، حالانکہ تمام مدارس کے نصاب میں اگر اسے داخل کیا جائے تو غالباً دوسرے نصابی متون سے وہ زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مطبوعہ بریلی الکٹرک پریس (مرٹھ)

ہندوستان میں مسلمانوں کا

نظامِ تعلیم و تربیت

تالیف حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

کتاب کی اہمیت و عظمت کے لیے صرف مؤلفِ کتاب کا نام نامی زبردست ضمانت ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے اپنے مخصوص اندازِ تحریر میں یہ واضح کیا ہے کہ ہندوستان میں قطب الدین ایبک کے زمانہ سے لیکر آج تک تاریخ کے مختلف دوروں میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم کیا رہا ہے۔ تحقیق و تفصیل کتاب کی جان ہے۔ جگہ بہ جگہ نہایت اہم، مفید اور معرکۃ الآرا مباحث آگئے ہیں، اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب ہے۔ اندازِ بیان ایسا دلکش ہے کہ شروع کرنے کے بعد کتاب چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ تصوف کی چاشنی نے کتاب کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے قیمت چار روپے۔

سیرتِ نبویہ کے متعلق ساڑھے تین سو جدید نظریات

پیغمبرِ اسلام کو برہانِ کامل کی صورت میں پیش کرنیوالی کتاب

النبی الخاتم

تصنیف رئیس التحریر حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ

اس جلیل القدر اور عدیم النظیر کتاب میں سیرتِ نبوی کے متعلق قریباً چار سا[illegible] سو عنوانات کے ماتحت بحث کی گئی ہے جن میں تین سو سے زائد [illegible] کا تعلق اُن جدید نظریات سے ہے جن کی طرف سیرت کے بارے [illegible] سے پہلے غالباً کسی مؤلفِ سیرت نے توجہ نہیں کی، اس کتاب کو دیکھ کر ہر صاحبِ عقل و بصیرت انسان اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور مقدس زندگی ہی اُن کی صداقت کی روشن ترین دلیل ہے جس کے بعد کسی دلیل و برہان کی قطعاً حاجت نہیں کتابت اور طباعت خندہ الدیدہ زیب ہے۔ کاغذ بہترین سفید چکنا۔ قیمت ایک روپیہ دو آنے (عم)، مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

مذہب کے بنیادی مسائل عقل کی روشنی میں

اسلام کو دینِ فطرت ثابت کرنیوالی مختصر مگر جامع کتاب

الدین القیم

مصنفہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ

دین کے مہمات اور ان مشکل مسائل پر جنہیں آج نافہمی سے مشکل سمجھا جاتا ہے حضرت مصنف نے ایسے اچھوتے فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ خود منکروں اور مشکل کہنے والوں کی عقلوں پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ ظاہری لحاظ سے کتاب اگرچہ بہت بڑی نہیں ہے لیکن ملاحظہ فرمانے کے بعد آپ اندازہ فرمائیں گے کہ مصنف نے اس چھوٹے سے "کوزہ" میں کتنے وسیع سمندروں کو بند کرنے کی کوشش کی ہے — اور عقائد کے ساتھ "تصوف" کے بھی کتنے اہم اور دقیق مسائل کو اس کتاب میں حل کر دیا گیا ہے شروع میں مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی بی اے کے قلم سے مختصر سا پیش لفظ ہے۔ کاغذ عمدہ قیمت عہ کاغذ معمولی عہ

ملنے کا پتہ: مکتبہ الفرقان بریلی۔ (یو-پی)